اور اتباع سنت کی ترغیب دی ہے، اور ان کو اس دور کے کفر و الحاد سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے، خود عالمگیرؒ کو انھوں نے متعدد نصیحت آمیز خطوط لکھے ہیں، ان کے ان خطوط کے پڑھنے سے پتہ چلے گا کہ دوسرے مغل بادشاہوں کے مقابلہ میں عالمگیر کے اندر جو غیر معمولی دینی احساس تھا وہ اسی خانوادۂ مجددیہ کا فیض ہے،

اس کی اشاعت پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سندھ یونیورسٹی بھی قابل مبارک باد ہے، اس کتاب کا نام تاریخی ہے، یعنی اس سے ۱۱۱۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔

مقالات امینی - از مولانا محمد تقی امینی صاحب، صفحات ۸۴، کتابت، طباعت عمدہ

ادارۂ علم و عرفان، اللہ رکھا بلڈنگ (اجمیر)

مولانا تقی امینی صاحب کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں اسلامی فقہ پر اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا تھا، مولانا نے اس موقع پر تین مقالے پیش کیے جو پسند کیے گئے، انہی مقالوں کو مقالات امینی کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، پہلا مقالہ اجتہاد پر اور دوسرا تیسرا تدوین فقہ اور فقہ کے اجتماعی مسائل پر ہے،

تینوں مقالوں کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ شریعت اسلامی حالات کے مطابق اجتماعی مسائل کے حل کرنے میں درماندہ نہیں ہے، البتہ جس طرح ہر قانون کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو حالات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ حالات کو وہ اپنا تابع بناتے ہیں، بالکل یہی صورت اسلامی شریعت کی بھی ہے، اس نے اپنے مبادی اور بنیادی اصولوں کو باقی رکھتے ہوئے ہمیشہ اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے،

امید ہے کہ یہ مقالے اہل علم میں شوق سے پڑھے جائیں گے اور جن مسائل پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ان پر وہ سنجیدگی سے غور کریں گے۔

"م، ج"

جلد ۹۳ - ماہ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۴ء - عدد ۶

فہرست مضامین

آہ جواہر لال

ہندوستان کی عظمت کا آفتاب غروب ہو گیا

جس نازک وقت کا خطرہ کروڑوں دلوں کو مضطرب کیے رہتا تھا بالآخر پیش آکر رہا، اور وہ آواز جو تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کے در و دیوار میں گونجتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی وہ حیات آفریں جس نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں زندگی کی رُوح پھونکی، خود موت کے آغوش میں سو گیا، وہ آفتاب جس کی ضیا باریوں نے نہ صرف ہندوستان کو منور کیا بلکہ دوسرے ملکوں تک اسکی روشنی پھیلی ۲۷ مئی کو عین دوپہر کے وقت ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ پنڈت جواہر لال کی موت ایسا حادثہ نہیں جس کو زمانہ کی گردش بھلا سکے۔ ان کا جسم گو خاک میں مل چکا ہے لیکن ان کی رُوح ہندوستان میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کے ذرے ذرے پر ان کا نام ثبت رہے گا۔

وہ آزاد ہندوستان ہی کے بانی اور اس کے معمار نہ تھے، بلکہ پورے ایشیا کی آبرو اور دنیا کی عظیم شخصیتوں میں تھے، ہندوستان نے ابتک جتنی بڑی شخصیتیں پیدا کیں ان میں بعض قدیم مذہبی پیشواؤں کو چھوڑ کر پنڈت جواہر لال کا درجہ سب میں بلند تھا، انھوں نے نصف صدی تک ہندوستان کی مسلسل اور ان تھک خدمت کی، وہ جنگ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے، آزاد ہندوستان کے معمار بھی اور اس کے محبوب لیڈر بھی، اس لیے انھوں نے دلوں پر حکمرانی کی اور کل سترہ سال میں جو قوموں اور ملکوں کی عمر کے لحاظ سے نہایت قلیل مدت ہے، ہندوستان کا درجہ ساری دنیا میں بلند کر دیا۔

پنڈت جواہر لال کی جیسی تاریخ ساز شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنا نام صفحۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت کر جاتی ہیں، ان میں جتنے اوصاف جمع تھے مشکل ہی سے کسی ایک انسان میں انکا اجتماع ہوتا ہے، وہ اس دور کے بہت بڑے مدبر اور مفکر تھے، ان کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ جو آواز ان کے منہ سے نکلتی تھی، ساری دنیا میں گونج جاتی تھی، وہ ایشیا کا مرکز ثقل تھے اس لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ان کی دوستی کے لیے مسابقت کرتی تھیں، ان میں اتنی عظمت و کشش تھی کہ بڑی سے بڑی شخصیت کو متاثر اور مخالفین تک کو مسحور کر لیتی تھی، وہ اس ایٹمی دور میں امن و آزادی کے بڑے علمبردار تھے، محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت میں ان کا قدم سب سے آگے تھا، ان کی آواز نے ایشیا کی آزادی پر بڑا اثر ڈالا، اس اعتبار سے وہ پورے ایشیا کے لیڈر تھے۔

اتنی طویل مدت تک پوری مقبولیت کے ساتھ حکومت اور ملک و قوم کی خدمت کی مثال دنیا کے موجودہ لیڈروں میں نہیں مل سکتی، انھوں نے قانون کی تو پسے نہیں بلکہ اپنی مقبولیت سے دلوں پر حکمرانی کی انکے خیالات بہت بلند اور دل بڑا وسیع تھا، اس کا دروازہ بلا امتیاز رنگ و نسل اور مذہب و ملت ہر شخص کے لیے کھلا ہوا تھا، وہ پرانی مشرقی تہذیب کے یادگار تھے، ان میں اس کی تمام شرافتیں اور وضعداریاں جمع تھیں، اپنے پرانے دوستوں اور ادنیٰ ادنیٰ درجہ کے ملنے والوں کے ساتھ تعلقات کو جس طرح نباہا اس کی مثال اس درجہ کے آدمیوں میں کم ملے گی، غرض جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے، جواہر لال ہندوستان کے ایک انمول جوہر تھے، اور ان کی وفات تنہا ہندوستان کا نہیں، بلکہ عالم انسانیت کا حادثہ ہے، اور ان کی ذات پر تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا، آیندہ ہندوستان میں اتنی بڑی اور ایسی جامع اوصاف شخصیت کے پیدا ہونے کی امید نہیں۔

دار المصنفین کے لیے پنڈت جی کی وفات تنہا قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، دار المصنفین سے ان کے اور پنڈت موتی لال کے تعلقات بہت قدیم تھے، خلافت اور نان کو اپریشن تحریک کے زمانہ میں اور اس کے بعد ایک عرصہ تک دار المصنفین قومی و سیاسی تحریکوں کا ایک بڑا مرکز رہا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی اس زمانہ کے ممتاز لیڈروں میں تھے، سید صاحب تو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے

رکن بھی تھے، اس لیے اس زمانہ کے بڑے لیڈروں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو دار المصنفین نہ آیا ہو، پنڈت موتی لال اور پنڈت جواہر لال جب اعظم گڈھ کے دورے پر آتے تھے تو دار المصنفین ہی میں قیام کرتے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کی آخری آمد ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں ہوئی تھی، وزارت کے زمانہ میں اس کی کوئی تقریب نہ پیدا ہو سکی، خیال تھا کہ دار المصنفین کی پچاس سالہ جوبلی میں ان کو شرکت کی دعوت دیجائے گی، لیکن افسوس ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

پنڈت جی نے ان تعلقات کو آخر عمر تک نباہا، وہ دار المصنفین کے لائف ممبر بھی تھے، انکی ممبری کا یہ سبق آموز واقعہ قابل ذکر ہے کہ لائف ممبری کی فیس ایک ہزار روپئے ہے، مولانا مسعود علی صاحب نے جب انکو ممبر بنایا تو انھوں نے اس کی پہلی قسط ڈھائی سو روپے کی دی، مولانا مسعود علی صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہو کر ایک ہزار یکمشت نہیں دے سکتے، انھوں نے کہا مجھکو جو تنخواہ ملتی ہے اس میں سب کٹ کٹا کر دو ہزار ماہوار کے قریب میرے ہاتھ میں آتا ہے، اس میں ایک ہزار یکمشت دینے کی گنجائش کہاں، یہ واقعہ ان کی عظمت کا کتنا بڑا ثبوت اور ہمارے بہت سے وزراء کے لیے کس قدر سبق آموز ہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب دار المصنفین مالی مشکلات میں مبتلا ہوا تو مولانا ابو الکلام نے پنڈت جی کی تائید بلکہ تحریک سے وزارت تعلیم کیجانب سے ساٹھ ہزار روپئے کی امداد دی، اس وقت مولانا ابو الکلام سالانہ امداد دینے کے لیے بھی تیار تھے، لیکن دار المصنفین کے کارکنوں نے اس کو منظور نہیں کیا، اس لیے پنڈت جی دار المصنفین کے محسن بھی تھے، اور ان کی وفات سے اس کا ایک بڑا قدر دان اٹھ گیا، ان کے جانشینوں میں یہ وضعداری کہاں، ان کے بعد کی نسل بلکہ ان کے بہت سے معاصر تو دار المصنفین کو شاید جانتے بھی نہ ہوں گے، پنڈت جواہر لال کی وفات پر ان کے دار المصنفین میں قیام کے زمانہ کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا، اور ان کے اور پنڈت موتی لال نہرو کے بہت سے دلچسپ واقعات اور لطائف یاد آگئے، جو کسی موقع پر پیش کیے جائیں گے،

مقالات

بعض رائج الوقت اصطلاحیں

اور

اُن کا پس منظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرت علیؓ کا ایک مشہور تاریخی فقرہ ہے "کلمۃ حق اُرید بہا الباطل" یعنی بات سچی ہے مگر اس سے باطل مراد لیا گیا ہے، یہ مقولہ آج بھی صادق آتا ہے، اس زمانہ میں بہت سی ایسی اصطلاحیں رائج ہو گئی ہیں جو اپنے اصل مفہوم اور مقصد کے لحاظ سے تو صحیح ہیں، لیکن ان کو بول کر ان سے غلط معنی مراد لیے جاتے ہیں، ان اصطلاحوں میں سب سے رائج الوقت تعصب، تنگ نظری، عدم رواداری، فرقہ پروری اور رواداری ہیں، ان معنوں میں بلا شبہہ یہ چیزیں نہایت مذموم ہیں کہ اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کے سوا دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں کو برا سمجھا جائے، ان سے نفرت اور ان کی بدخواہی کیجائے، لیکن آجکل کی اصطلاح میں مذہبی عقائد میں رسوخ و پختگی اور اس پر استقامت کا نام تعصب، ہر قسم کے عقائد و خیالات کو خواہ وہ کتنے ہی متضاد ہوں، صحیح اور یکساں نہ ماننے کا نام تنگ نظری اور عدم رواداری اور ان سب کو حق اور صحیح تسلیم کرنے کا نام رواداری اور اپنی مذہبی و ملی خصوصیات کے تحفظ اور اس پر قائم رہنے کا نام فرقہ پروری ہو گیا ہے، اور اسکا ملزم زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں کو بنایا جاتا ہے، اس لیے اس کا تجزیہ کر کے اصل حقیقت کا پتہ چلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

درحقیقت کسی عقیدے اور نظریۂ حیات کی صداقت اور افادیت پر یقین کامل کا جس کو مذہبی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں، یہ لازمی اور فطری نتیجہ ہے کہ صرف اسی عقیدے اور نظریۂ حیات کو حق، انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ مفید اور قابل قبول سمجھا جائے، اور اس کے سوا تمام دوسرے عقائد کو غلط، غیر مفید بلکہ مضر سمجھا جائے اور ان سے کامل علیحدگی اختیار کیجائے، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان ایک عقیدہ اور نظریۂ حیات کی صداقت اور افادیت پر یقین کامل بھی رکھے اور اس کے مقابل اور متضاد عقائد کو بھی صحیح اور قابل قبول سمجھے، اور یہ اصول نہ صرف مذہبی عقائد بلکہ دنیاوی اور مادی امور و معاملات میں بھی کار فرما ہے، اور اسی پر ساری دنیا کا عمل ہے، مثلاً یورپ اور امریکہ جمہوریت اور سیکلرزم کی افادیت پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور اس کو سب سے بہتر نظام حکومت سمجھتے ہیں، اس لیے وہ اس کے علاوہ اور کسی نظام کو بھی قابل قبول نہیں سمجھتے اور جمہوریت کو ساری دنیا میں جاری کرنا چاہتے ہیں، یہی نقطۂ نظر کمیونزم کے بارہ میں کمیونسٹوں کا ہے، بلکہ وہ اس بارہ میں اور بھی زیادہ سخت ہیں، ان کو جبر و قوت سے بھی اپنے نظریۂ حیات کو پھیلانے میں تامل نہیں ہے، چنانچہ ان دونوں کی کشمکش نے انسانی خدمت کے نام پر پوری دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، آج سے چند سال پہلے قومی افتخار اور سربلندی کے لیے جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹر شپ کا عروج تھا، اور اس کے لیے انھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کو زیر و زبر کر ڈالا، اپنے پورے ملک اور قوم تک کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا اور معلوم ہوتا تھا کہ ڈکٹیٹر شپ کا سیلاب پورے یورپ کو بہا لیجائے گا اور جمہوریت کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

اس لیے اگر کسی عقیدہ پر رسوخ و استقامت اور اس کے سوا دوسرے عقائد کو غلط سمجھنے کا نام تعصب و تنگ نظری اور عدم رواداری ہے، تو اس کا مجرم تنہا مذہب ہی کیوں ہے، اور رواداری کا سارا وعظ اسی کے لیے کیوں مخصوص ہے، دنیاوی نظاموں کا فائدہ تو

زیادہ سے زیادہ اسی مادی دنیا تک محدود ہے، اس کے مقابلہ میں ایک صاحب مذہب کا تو اس پر ایمان ہوتا ہے کہ سارے عالم کی دینی و دنیوی فلاح و سعادت اس کے مذہب سے وابستہ ہے، اس لیے اس پر استقامت نہ صرف اس کی ذات اور اس کے ہم مذہبوں کے لیے ضروری ہے بلکہ دوسروں کو اس کی دعوت دینا اس کا انسانی فرض ہو جاتا ہے،

ممکن ہے یہ مثالیں ان لوگوں کی نگاہ میں کھٹکیں جو دین و دنیا اور مذہب و سیاست کو جدا سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک مذہب پر دنیاوی نظاموں کا قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن معترضین زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں ہی کو تعصب و تنگ نظری وغیرہ کا طعنہ دیتے ہیں، اس لیے ہم کو اسلام ہی کے نظامِ حیات کو سامنے رکھکر بحث کرنا ہے، اسلام میں دین و دنیا اور مذہب و سیاست جدا نہیں ہے، بلکہ ان پر سب حاوی ہے، معترضین کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ اسلام کو بھی ان مذاہب پر قیاس کرتے ہیں جن میں مذہب کا دائرہ صرف عبادت گاہوں تک محدود ہے، اور ان کو انسان کی دنیاوی اور مادی زندگی اور دنیاوی معاملات سے کوئی بحث نہیں، اسی لیے اسلام پر اعتراض کرتے ہیں، اگر وہ اسلام کی جامعیت کو سمجھ لیں تو بہت کم اعتراض کا موقع باقی رہ جاتا ہے،

یہی حال فرقہ پروری کی اصطلاح کا ہے، دوسرے فرقوں سے نفرت اور انکی بدخواہی بلاشبہہ مذموم ہے، جس کی کوئی مذہب اجازت نہیں دیتا، لیکن اپنی مذہبی و ملی خصوصیات اور اپنے حقوق کا تحفظ اور اپنے فرقہ کی جائز حمایت تو ہر فرقہ کا قانونی اور اخلاقی حق ہے، لطف یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو فرقہ پروری کا طعنہ دیتے ہیں، اس کے سب سے بڑے مجرم وہی ہیں، چنانچہ یورپ کی کوئی قوم بھی اپنی تہذیبی خصوصیات کا ایک جزء بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا میں اس کو پھیلانا چاہتی ہے، ہندوستان اپنی ہزاروں سال کی پرانی اور بوسیدہ

تہذیب تک کو زندہ کرنے میں لگا ہوا ہے، اگر آج بھی دنیا کے کسی حصہ میں عیسائیوں پر کوئی مصیبت آجاتی ہے تو پورا یورپ اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، بلکہ ان کی بے جا اور غلط شکایتوں پر دوسری قوموں اور حکومتوں پر فوجکشی تک کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا، اور آج یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں ساری دنیا کے عیسائیوں کی نگہبان ہیں، ہندوستان کی فرقہ پروری تو روزانہ کا تجربہ ہے، ہندوستان کے مسلمان یہاں کے شہری ہیں، اور دستوری لحاظ سے ان کو وہی حقوق حاصل ہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں لیکن عملاً ان کے ساتھ اجنبیوں کے جیسا سلوک ہے، ان پر آئے دن مصائب ٹوٹتے رہتے ہیں، لیکن زبانی جمع خرچ کے علاوہ ان کے ازالہ کی کوئی موثر تدبیر نہیں کیجاتی، بلکہ اب تو زبانی ہمدردی بھی ختم ہوتی جاتی ہے، اور کسی کی زبان پر انکی مظلومیت کا ذکر تک نہیں آتا، اور پاکستان کے ہندوؤں کی مظلومیت پر پورا ہندوستان چیخ اٹھتا ہے، اور پارلیمنٹ کے ایوان تک میں شور برپا ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ صریح فرقہ پروری اور کیا ہو سکتی ہے، بلاشبہہ پاکستان کے مظلوم ہندو ہمدردی کے مستحق ہیں، لیکن کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا اتنا بھی حق نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ ان اصطلاحوں کے استعمال کرنے والوں کے نزدیک ان کا ہر فعل عین قوم پروری اور مسلمانوں کا ہر عمل فرقہ پروری ہے،

درحقیقت اس قسم کی رواداری کا وجود کہ سارے مذاہب حق اور ہر قسم کے عقائد و خیالات یکساں ہیں، اولاً تو کہیں بھی نہیں ہے، اور اگر بالفرض کسی مذہب میں ہو بھی تو ان مذاہب میں نہیں ہو سکتی جن کے مثبت و منفی عقائد ہیں، یعنی جن میں کچھ چیزوں کا ماننا اور کچھ چیزوں سے انکار اور علیحدگی ضروری ہے، ایک موحد کس طرح شرک کو اور ایک خدا پرست الحاد کو ایک درجہ دے سکتا ہے، لیکن اس کو وہ قومیں نہیں سمجھ سکتیں جن کے مذہب میں سرے سے مثبت و منفی عقائد ہی نہیں ہیں، اس قسم کی رواداری کا سب سے بڑا مبلغ یورپ ہے، لیکن اس کے نزدیک بھی سارے مذاہب حق اور ہر قسم

کے عقائد و خیالات یکساں نہیں ہیں، ورنہ انسانوں کی نجات کے لیے باپ بیٹے روح القدس کی الوہیت پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے، اور اس نے ساری دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کا جال کیوں پھیلا رکھا ہے، حقیقت یہ ہے کہ رواداری کے صحیح مفہوم کے لحاظ سے جتنی رواداری اسلام میں ہے کسی مذہب میں نہیں ہے، اسلام کی تبلیغ میں جبر نہیں، قرآن مجید کا صریح حکم ہے:

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ

دین میں زبردستی نہیں، راہ راست گمراہی سے علانیہ ممتاز ہو چکی،

اسلام کا قبول کرنا نہ کرنا ہر شخص کی مرضی پر موقوف ہے،

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ

کہدو سچی بات (اسلام) تمہارے رب کے پاس سے آئی ہے، پس جو چاہے قبول کرے جو چاہے قبول نہ کرے۔

تبلیغ کے لیے جنگ و جدال کے بجائے حکمت و دانائی اور پند و موعظت ضروری ہے، اگر بحث و مباحثہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے کرنا چاہیے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ

اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی نصیحتوں سے بلاؤ اور بہت پسندیدہ طورسے ان سے بحث کرو،

اور یہی تعلیم عین فطرت کے مطابق ہے، اس لیے کہ قبول اسلام نام ہے اس پر دل سے یقین اور زبان سے اس کے اقرار کا۔ جبر و قوت سے زبان سے تو اقرار کرایا جا سکتا ہے، لیکن دل میں یقین نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اس لیے وہ اسلام ہی معتبر نہیں جس کا جبر و زور سے اقرار کرایا جائے، اسلام میں دوسرے مذاہب کے معبودان باطل کو بھی برا کہنے کی ممانعت ہے:

لَا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبو اللہ عدواً بغیر علمٍ	مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں (یعنی انکی پرستش کرتے ہیں) ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ بھی نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں۔

تقریباً تمام مذاہب میں کسی نہ کسی نوع کی انسانی تفریق اور طبقاتی تعصب ہے، حتی کہ عیسائی مذہب میں بھی کالے گورے عیسائیوں کی تقسیم ہے، اور ہندو مذہب میں تو پست وبلند اور ادنی و اعلیٰ کے مستقل طبقات قائم ہیں، اور ادنی طبقوں کے ساتھ اعلیٰ طبقوں کا سلوک غلامانہ ہے، جو تعصب ہی کی ایک قسم ہے، لیکن اسلام نے سارے انسانوں کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی تعلیم دی ہے۔

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ	ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہ مخلوق ہے جو اسکے کنبے (یعنی تمام انسانوں) کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرتا ہے۔
ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء	مسلمانو! تم زمین پر بسنے والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا (یعنی خدا) رحم کریگا۔

اس سے زیادہ رواداری اور انسانی ہمدردی کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے، تہذیبی رواداری اور کلچرل اخذ و استفادہ مسلمانوں کی خاص خصوصیت رہی ہے، انھوں نے نہ اپنی تہذیب دوسروں پر زبردستی مسلط کی اور نہ دوسری قوموں کی تہذیبوں کے استفادہ سے پرہیز کیا، انھوں نے ہر قوم کی تہذیب کے اچھے عناصر کو اپنی تہذیب میں شامل کر لیا، اسی لیے جو تہذیبی

رنگارنگی مسلمانوں میں نظر آتی ہے، وہ دنیا کی کسی قوم میں بھی نہیں پائی جاتی، اور ہندوستانی تہذیب سے تو وہ اتنا متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، اور آج ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب سے ہندی عناصر کو جدا کرنا مشکل ہے، لیکن اسلام ایک کامل اور مکمل مذہب ہے، اس کے بنیادی عقائد و تصورات ہیں، جن میں سے بعض کا انسانوں اور بعض سے علیحدگی ضروری ہے، اس لیے مسلمان تمام مذاہب اور ہر قسم کے متضاد عقائد کو ایک درجہ میں نہیں رکھ سکتے، لیکن اسلام میں نہ کسی مذہب کو برا کہنے کی اجازت ہے اور نہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی انسان سے نفرت کی تعلیم ہے، بلکہ سارے انسانوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا حکم ہے،

درحقیقت تعصب، تنگ نظری، رواداری، عدم رواداری اور فرقہ پروری وغیرہ کی اصطلاحیں یورپ کی وضع کردہ ہیں، جو مذہب سے تقریباً آزاد ہو چکا ہے، کم سے کم انکی عملی زندگی میں اس کا کوئی اثر نہیں ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ گرجوں کی چہار دیواری تک محدود ہے اور مذہب کی جگہ سیاست نے لے لی ہے، اس لیے سیاست میں ان کے یہاں کسی قسم کی رواداری نہیں ہے، اور اس میں وہ چنگیز و ہلاکو بن جاتا ہے، اور رواداری مذہب کے لیے مخصوص کر دی ہے، اور اپنے مصالح کی بنا پر تعصب، تنگ نظری، عدم رواداری وغیرہ کا سب سے زیادہ نشانہ اسلام اور مسلمانوں کو بنایا ہے، ان کی تقلید میں وہ قومیں بھی ان کی ہمنوا ہو گئی ہیں، جن کے یہاں مذہب کے کوئی حدود و قیود نہیں ہیں، یا جن کو ان کے خیال میں مسلمانوں سے کسی قسم کا نقصان پہنچا ہے،

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور عیسائیوں کی دشمنی کے اسباب کھلے ہوئے ہیں، وہ صدیوں ایک دوسرے کے حریف رہ چکے ہیں، عیسائی دنیا کو سب سے زیادہ نقصان

اسلام اور مسلمانوں ہی سے پہنچا، اسلام کے ظہور سے پہلے مذہبی اور سیاسی سیادت عیسائیوں کے ہاتھوں میں تھی، یہودی بھی تھے لیکن ان کا حلقۂ اثر بہت محدود تھا، اور عیسائی مذہب اور اس کی حکومتیں سارے مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک تک اور پورے یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں، مسلمانوں نے ایشیا اور افریقہ کے ہر حصے سے ان کی حکومتیں ختم کر کے ان دونوں براعظموں سے ان کو بالکل بے دخل کر دیا، یورپ میں جو ان کا گڑھ تھا، تقریباً پورے اسپین و پرتگال، اٹلی اور فرانس کے بعض حصوں، بحر روم کے بڑے بڑے جزائر پر قبضہ کر لیا، اور آخر میں مشرقی کلیسا کے مرکز قسطنطنیہ اور بلقانی ریاستوں کو فتح کر لیا، دونوں میں صدیوں تک جنگ صلیبی کا سلسلہ جاری رہا، جس میں مسلمانوں نے متحدہ یورپ کو شکست دی، اس لیے مسلمانوں سے ان کی دشمنی کچھ بیجا نہیں ہے،

لیکن اگر عیسائیوں کو مسلمانوں سے سیاسی حیثیت سے نقصان پہنچا تو علمی اور تمدنی حیثیت سے اس سے زیادہ فوائد پہنچے، انہی کی بدولت وہ علم و تمدن سے آشنا ہوئے، جب پورا یورپ وحشت و جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھا، مسلمانوں نے اسپین اور سسلی میں علم و تمدن کی شمع روشن کی جس کی روشنی پورے یورپ میں پھیلی، اگر یہ یونیورسٹیاں نہ ہوتیں تو یورپ صدیوں تک جہالت کی تاریکی میں مبتلا رہتا اور اس کو جو درجہ آج حاصل ہے، وہ کبھی حاصل نہ ہوتا، عیسائی مذہب کی بھی بہت سی اصلاحات اسلام کی رہین منت ہیں، یورپ پر مسلمانوں کے علمی و تہذیبی احسانات کا تمام یورپین مصنفین کو اعتراف ہے،

یہ تو پرانی داستان ہے، آج بھی یورپ کا سب سے زیادہ سابقہ مسلمانوں ہی سے ہے، وہ پورے بحر روم کے ساحلی علاقہ پر قابض ہیں، جو افریقہ اور ایشیا میں یورپین اقوام کے داخلہ کا راستہ ہے، دنیا کے مختلف خصوصاً شمالی افریقہ سے لیکر پورے مشرقی وسطیٰ اور ایشیائے کوچک تک

اسلامی حکومتیں پھیلی ہوئی ہیں، جو ان کی بین الاقوامی سیادت میں حائل ہیں، اس لیے وہ ان کی نگاہ میں کھٹکتی رہتی ہیں، اور جہاں موقع ملتا ہے ان کو نقصان پہنچانے سے نہیں چوکتیں اور ان کو کمزور کرنے کے لیے ہر قسم کی چالیں چلتی رہتی ہیں، انھوں نے قومیت اور وطنیت کے نام پر عربوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور ان کو مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کر کے انکی قوت کمزور کر دی، فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم کر کے مشرق وسطیٰ میں اپنا ایک مضبوط قلعہ قائم کر دیا۔

گو مسلمانوں میں بڑی حد تک مذہبی روح ختم ہو گئی ہے، اس کے باوجود آج بھی مذہب کا جتنا اثر مسلمانوں میں ہے، کسی قوم میں نہیں ہے، جس پر مشنریوں کی رپورٹیں شاہد ہیں، لیکن آزادی و جمہوریت کے اس دور میں ان کو جبر و قوت سے دبانا مشکل ہے، اسلام کی علانیہ مذمت اور اس پر کذب و افترا کی گنجائش بھی بہت کم باقی رہ گئی ہے، اس لیے مسلمانوں کے مذہبی جذبہ کو ختم، ان کے مذہب سے ان کو بدگمان اور دوسری قوموں میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے انھوں نے مختلف تدبیریں اختیار کی ہیں، ان میں سب سے کارگر حربہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد اس میں کوئی ایسا عیب نکال دیتے ہیں کہ ساری خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے، علم و تحقیق کی راہ سے اسلام کے اصل سرچشمے قرآن و حدیث میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں، واقعات میں تدلیس سے کام لیکر ان سے غلط نتائج نکالتے ہیں، انفرادی واقعہ سے کلیہ بنا لیتے ہیں، بے سند روایات بلکہ کبھی کبھی اپنے مفروضات پر پوری عمارت کھڑی کر دیتے ہیں، مسلمانوں کی تاریخ غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں، اس قبیل کے اور مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں[1]، ان میں ایک

---

[1] سب مستشرقین اس زمرے میں نہیں آتے، ان میں کچھ منصف مزاج بھی ہیں، جنھوں نے اسلام کی دینی اور روحانی برکتوں اور مسلمانوں کے علمی و تہذیبی کارناموں اور یورپ پر ان کے احسانات کا پورا اعتراف کیا ہے، اور متعصب پادریوں اور مستشرقین کی پھیلائی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، اور مسلمانوں کی اتنی گرانقدر علمی

(باقی ص ۴۱۴ پر)

چلتا ہوا نسخہ تعصب، تنگ نظری اور عدم رواداری کا بھی ہے، بعض مسلمان سلاطین کے طرزِ عمل
سے جو کسی حیثیت سے بھی اسلام کے نمایندے نہ تھے، اور جنکی سیاست اسلامی قوانین کے بجائے
حکومت کے مصالح کے تابع تھی، اور بعض متشدد فقہاء کے فتاوی سے جنکی قرآن مجید اور احادیث
نبویؐ میں کوئی سند نہیں ہے، اور ایرانی نژاد، فارسی مورخین کی تحریروں سے جن کی فطرت میں
مبالغہ آرائی ہے، غیر مسلموں پر ظلم و تشدد کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہیں، اس سے ان کو ایک
سند ہاتھ آجاتی ہے، اور وہ اس رائی کو پہاڑ بنا کر مذہب اسلام اور پوری مسلمان قوم کو
تعصب اور تنگ نظری وغیرہ کا مجرم بنا دیتے ہیں،

ایک زمانہ تک مغربی قوموں سے مسلمانوں کی مرعوبیت کا یہ حال رہا کہ وہ مذہب کو بھی انہی
کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے تھے، جہاں یورپین مصنفین کی زبان سے کوئی اعتراض نکلا اس کی
صحت کو جانچے بغیر یا اس سے انکار کر دیا یا اس کی ایسی لغو تاویل شروع کر دی جس کو مذہب سے
کوئی علاقہ نہیں، بہتیرے مذہب سے ناواقف اور ضعیف العقیدہ مسلمان ان اعتراضوں کے اثر سے
اپنے مذہب ہی سے بدگمان ہو جاتے تھے، مگر اب یہ مخلوق کم ہو گئی ہے اور مسلمانوں میں ایسے اہل علم
و نظر پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے ان اعتراضوں کی دھجیاں اڑا دیں، لیکن اب بھی گذشتہ
مرعوبیت کے کچھ نہ کچھ آثار باقی ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۳) خدمات انجام دی ہیں جو خود مسلمانوں سے نہ ہو سکیں، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی
نادر و نایاب کتابوں کو تلاش کر کے بڑی محنت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا، اپنی زبانوں میں
ان پر مضامین لکھے اور ان کے ترجمے کئے، اگر ان کی کوششیں نہ ہوتیں تو آج بہت سے نوادر گوشۂ
گمنامی میں پڑے رہتے، لیکن اب بھی ان کی اکثریت اغراض سے خالی نہیں ہے اور وہ اپنی اسلام
دشمنی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔

اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ انگریزوں نے اسی آزمودہ نسخہ کو ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کیلئے استعمال کیا،
اور ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ بہت مسخ کر کے دکھائی، اب یہی نسخہ ہندوستان کا ایک طبقہ
مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے، اور اس کے مورخین اور اہل قلم اس مہم میں لگے ہوئے ہیں،
اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کے خلاف آئے دن کتابیں اور مضامین نکلتے رہتے
ہیں جس سے پوری فضا مسموم ہو گئی ہے،

انگریز تو اجنبی قوم تھے، وہ تو اپنا کام پورا کر کے ہندوستان سے رخصت ہو گئے، لیکن
ہندوستان مسلمانوں کا وطن ہے، ان کو یہیں رہنا اور یہیں جینا اور مرنا اور ہندو مسلمان دونوں
کو مل کر آزاد ہندوستان کی تعمیر کرنا ہے، اس لیے اب ضرورت اس کی ہے کہ گذشتہ واقعات کی
تلخیوں نے ان دونوں میں جو خلیج پیدا کر دی ہے، اس کو ہر پہلو سے پاٹنے کی کوشش کی جائے۔
کسی ملک و قوم کی تعمیر ماضی کی تلخ یادوں سے نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے مصالح اور
ضروریات سے ہوتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ

(۱) اس قسم کے تمام واقعات اور اعتراضات کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور اسلام اور
مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کیا جائے، اور اسلام کے چہرہ کو
مخالفوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار سے پاک کر کے اس کی اصل شکل میں پیش کیا جائے،
اور مسلمان اپنے اسلامی کردار اور اخلاق و عمل سے اس کا ثبوت دیں،

(۲) ہر قوم میں اچھے برے دونوں طرح کے فرمانروا ہوتے ہیں، کوئی قوم بھی اس کا
دعوی نہیں کر سکتی کہ اس کے سارے حکمراں کل کے کل سراپا عدل و انصاف تھے، اس لیے
اگر کسی مسلمان بادشاہ کے ظلم و زیادتی کے کچھ واقعات ملتے ہیں تو ان کو اس کی ذات اور اسکی
سیاست کا نتیجہ سمجھا جائے، اسلام اور مسلمان قوم کو اس کا مجرم نہ بنایا جائے، یہ تاویل نہیں

بلکہ واقعہ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان میں جن مسلمان خاندانوں نے حکومت کی، انھی نے ایک دوسرے کو مٹایا، بلکہ بعض بادشاہوں نے ہندوستان کے باہر وسط ایشیا کی اسلامی حکومتوں تک کو ختم کردیا، علاء الدین جہانسوز نے غزنین کو جلا کر خاکستر کردیا، اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے تاریخ بھری ہوئی ہے، یہ سب کس مذہبی تعصب کا نتیجہ تھا۔

اس سلسلہ میں ایک اور پہلو پر بھی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، ہندوستان پر جتنے خاندانوں نے حکومت کی ان میں سب کے سب ترک، تاتاری اور پٹھان تھے، ان کا مذہب ضرور اسلام تھا لیکن وہ اسلام کے نمایندے نہ تھے، ان میں بعض صالح اور دیندار فرمانروا بھی تھے، جنھوں نے بہت سے مفید مذہبی کام بھی انجام دیے، لیکن ان کی حکومت صحیح معنوں میں اسلامی نہ تھی، اس کا پورا نظام، ان کا قومی و ملکی تھا، اس لیے اسکی خرابیاں اسلام کا نہیں بلکہ خود ان کے قومی نظامِ حکومت کی خرابی کا نتیجہ تھیں، اور انکی سیاست مذہب کے بجائے سیاست کے تابع تھی،

دوسرے اگر مسلمان حکمرانوں کے ظلم و زیادتی کے کچھ واقعات ملتے ہیں، تو اس سے کہیں زیادہ ان کے عدل و انصاف، ملک داری، اور رعایا پروری کے واقعات ہیں، مغلوں کی حکومت تو تقریباً سیکولر تھی، انھوں نے ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھا، جس کا اعتراف ہندو مورخین تک کو ہے، ممکن ہے بعض ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے مسلمان حکمرانوں سے ان کو اور ہندوستان کو کچھ نقصان بھی پہنچا ہو لیکن ان کے فوائد سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا، انھوں نے مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحد کیا، جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے یہاں اجنبیوں کی طرح حکومت نہیں کی، بلکہ اس کو وطن بنا کر یہیں بس گئے، اور ہندوستان کی دولت ہندوستان ہی پر صرف کی، ان سے ہندوستان کو جو گوناگوں فوائد پہنچے اور ان کے زمانہ میں یہاں جو مذہبی و معاشرتی

اصلاحات اور علمی و تہذیبی ترقیاں ہوئیں، اور جس طرح انھوں نے اس صحرا کو گلشن اور ہندوستان کو جنت نشان بنایا اس سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں،

(۳) یہ آزاد ہندوستان کی تعمیر کا دور ہے، جس کے لیے قومی اتحاد و یکجہتی سب سے مقدم شرط ہے، اس لیے ایسی تمام چیزوں سے احتیاط ضروری ہے جو تخریب اور مختلف فرقوں میں اختلاف پیدا کرنے والی ہوں، یہ پرانی تاریخ دہرانے کا نہیں بلکہ نئی تاریخ بنانے کا زمانہ ہے، اس کے لیے ایسی تاریخوں کی ضرورت ہے جو قومی وحدت کے لیے مفید ثابت ہوں، اس کا یہ مقصد نہیں کہ صحیح واقعات کو جھٹلایا جائے، یا برائیوں کو بھی خوبی بنا کر دکھایا جائے، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ جب تاریخ میں اچھے اور برے دونوں قسم کے واقعات ہیں اور خوبیوں کا پہلو غالب ہے جس سے کوئی مورخ انکار نہیں کر سکتا تو ان خوبیوں کو چھوڑ کر برے واقعات کو خواہ مخواہ کیوں اچھالا جائے، کیا قدیم ہندوستان کی تاریخ اس سے خالی ہے، خالص ہندوستانی مذاہب کے ماننے والوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا، برہمنی مذہب نے جینیوں اور بدھوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے، لیکن کیا آج کوئی ہندو مورخ اس کو دہراتا ہے، بلکہ اس کی پردہ پوشی کیجاتی ہے، اور قومی مفاد کے لیے یہی کرنا چاہیے، مسلمان بھی اسی ملک کے باشندے ہیں، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے، اس لیے آخر وہ اس سلوک سے کیوں محروم ہیں، اس کے بغیر قومی وحدت اور نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

یہ بڑی افسوسناک حقیقت ہے کہ ہندو مسلمانوں کا تقریباً ایک ہزار سال سے ساتھ ہے مگر ان دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے کی پوری کوشش نہیں کی، بعض مسلمان علماء نے تو علمی حیثیت سے ہندوستان کے مذاہب کا مطالعہ بھی کیا اور اس پر کتابیں بھی لکھیں، مگر ہندو عام طور سے اسلام سے چھوت ہی برتتے رہے، اگر دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو اتنی مذہبی غلط فہمیاں نہ ہوتیں، ان میں بہت سی اخلاقی و روحانی تعلیمات مشترک نظر آئیں گی، اب وقت آگیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مذاہب کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی،

ابو العلاء معری

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

ابو العلاء معری عربی زبان و ادب کا مایۂ ناز ادیب، نامور انشا، پرداز، باکمال شاعر اور فلسفہ و حکمت کا امام تھا، مورخین اور اصحاب سیر نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے لیکن اردو میں اس کے حالات اور فلسفہ و حکمت کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے، اس مضمون میں اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نام و نسب احمد نام، ابو العلاء کنیت، رہین المحبسین لقب، معری، تنوخی، قضاعی اور بحرانی وغیرہ نسبتیں ہیں، نسب نامہ حسب ذیل ہے:-

احمد بن عبد اللہ بن سلیمان بن محمد بن سلیمان بن احمد بن سلیمان بن داؤد بن مطہر بن زیاد بن ربیعہ بن حارث بن ربیعہ بن انور بن اسحم بن ارقم بن نعمان بن عدی بن عبد غطفان بن عمرو بن بریح بن خزیمہ بن تیم اللہ بن اسد بن دبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن حاف بن قضاعہ

مشہور اور مستند سلسلۂ نسب اسی طرح منقول ہے،[1] بعض اصحاب سیر کی روایتوں میں خفیف اختلاف ہے، جو قابل اعتنا نہیں، البتہ سمعانی اور یاقوت نے ۳ کے بجائے ایک سلیمان کا ذکر کیا ہے،[2]

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۰ و تاریخ ابن کثیر ج ۱۲ ص ۷۲، [2] کتاب الانساب ورق ۱۱۰ و معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۲ و بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶

معری: ابو العلاء کے وطن معرۃ نعمان کی طرف نسبت ہے، معرۃ نعمان اور معرہ مصرین شام میں حمص کے علاقہ میں دو مشہور شہر ہیں،[1]

معرۃ النعمان ایک زمانہ میں علم و فن کا بڑا مرکز رہ چکا ہے، اور بڑے بڑے اصحاب فن اور اہل کمال اس کی خاک سے اٹھے،

خرج منہا جماعۃ من الفضلاء فی کل فن[2]	یہاں ہر فن کے فضلاء اور اصحاب کمال پیدا ہوئے۔

ابو العلاء کا مولد و منشا یہی مردم خیز خطہ ہے، اس کی غیر معمولی شہرت کے سامنے معرہ کے دوسرے ارباب فضل و کمال کا چراغ نہ جل سکا

معرۃ نعمان کی جانب صحیح نسبت معرنی ہوگی لیکن اہل علم کے یہاں مشہور نسبت معری ہے اور جب اس کو مطلق بولا جاتا ہے تو مقصود معرۃ نعمان ہی کی طرف نسبت ہوتی ہے،[3]

رہین المحبسین ابو العلاء کا لقب تھا جس کو وہ اپنے لیے بہت پسند کرتا تھا، اس لقب ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ بغداد سے اپنے وطن معرہ واپس ہوا تو اس نے عزلت اور گوشہ گیری اختیار کرلی، اور گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دیا، صرف پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوگیا، آنکھوں کی روشنی بچپن ہی میں چلی گئی تھی، اس لیے وہ اپنے کو رہن المحبسین یا رہین المحبسین یا رہین الحبسین کہتا تھا،[4] ان دونوں کے علاوہ اس نے اپنے ایک اور حبس کا بھی ذکر کیا ہے،

أرانی فی الثلاثۃ من سجونی	فلا تسأل عن الخبر النبیث
لفقدی ناظری ولزوم بیتی	وکون النفس فی الجسد الخبیث[5]

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۶۰ [2] کتاب الانساب ورق ۵۳۷ [3] ایضاً ورق ۵۳۶ [4] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۹ و معجم الادباء ج ۱ ص ۱۷۰ و بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۷ [5] لزومیات ج ۱ ص ۱۶۰

پیدائش | تمام ارباب سیر و تذکرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ابوالعلاء ۳۶۳ھ مطابق ۹۷۳ء میں پیدا ہوا، ابن خلکان وغیرہ نے یہ تصریح کی ہے[1] کہ غروب آفتاب کا وقت جمعہ کا دن تھا، اور ربیع الاول (مطابق ۲۶ دسمبر) کی ۲۷ تاریخ تھی، ابوالفداء نے ۳۶۶ھ سنہ پیدائش بتایا ہے[2]، جو صحیح نہیں ہے،

خاندان | اگرچہ ابوالعلاء کا علمی و ادبی مذاق فطری تھا، لیکن اس کی علمی شخصیت کو بنانے میں اس کے خاندان اور ماحول کو بھی بڑا دخل تھا، وہ ایک ممتاز علمی گھرانے سے تھا

هومن بيت علم كبير فى بلده[3] — وہ اپنے شہر کے ایک معزز اور بڑے علمی خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا،

یاقوت نے اس کے خاندان کے علماء، فضلاء اور شعراء کا مفصل تذکرہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے:۔

"ابوالعلاء کے باپ، دادا، چچا وغیرہ ان سے پہلے اور ان کے بعد اس کے خاندان میں بہت سے علماء، فضلاء اور قضاۃ گذرے ہیں، مجھکو جن لوگوں کے حالات معلوم ہو سکے ان کو لکھتا ہوں تاکہ اس کے خاندان والوں کا بھی علم و فضل واضح ہو جائے۔"[4]

اس کے دادا، والد اور چچا حمص میں عہدۂ قضا پر فائز تھے، اس کے بھائی اور بھتیجے بھی علم و فضل اور شعر و ادب میں ممتاز تھے،[5]

ننہال بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا، ابوالعلاء کی نظم و نثر دونوں میں اپنے ننہال والوں کی علمی فضیلت و برتری کا ذکر ہے، جرجی زیدان کا بیان ہے:۔

"اس کا باپ ادیب اور دادا حمص کا قاضی تھا، اس کی ماں بھی ایک ذی وجاہت گھرانے

---

۱ ابن خلکان ج ۱ ص ۸۵ ۲ تاریخ ابی الفداء ج ۲ ص ۱۷۶ ۳ بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶ و روضات الجنات ص ۶۴
۴ معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۳ ۵ ایضاً ص ۱۶۳ تا ۱۶۹

(آل سبیکہ) سے تعلق رکھتی تھی، اس خاندان کے کئی آدمی علم و ادب میں مشہور تھے۔"[1]

اساتذہ | ابوالعلاء کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد بہت کم ہے، نحو، لغت اور ابتدائی تعلیم اپنے والد اور حلب میں محمد بن عبداللہ بن سعد نحوی سے پائی، حدیث کی روایت اپنے باپ، دادا اور عربیت کی تحصیل اپنے شہر میں بنی کوثر اور ابن خالویہ سے کی، طرابلس کے کتبخانہ سے استفادہ کے لیے جا رہا تھا تو راستہ میں لاذقیہ کے یونانی راہب سے فلاسفۂ یونان کے اقوال سنے، اسی سفر میں ہندوؤں کے فلسفہ سے بھی آگاہی حاصل کی یحییٰ بن مسعر اور ابوالفتح محمد بن حسنین سے بھی اس نے سماع کیا تھا،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے صرف قرب و جوار کے بعض علماء سے تعلیم پائی تھی، بعد میں جن لوگوں سے استفادہ کیا اس کو استادی اور شاگردی سے زیادہ تعلق نہیں ہے، ابوالفداء کا بیان ہے:

"وہ ۳۹۹ھ میں بغداد گیا، اور ایک سال سات مہینے وہاں رہ کر علماء سے استفادہ کیا، لیکن در اصل وہ کسی کا باقاعدہ شاگرد نہیں۔"[2]

ابوالفداء کے الفاظ "ولم يتلمذ ابوالعلاء لاحد اصلاً" سے تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ اصطلاحی معنوں میں اس کا کوئی استاد ہی نہ تھا، اور اس میں شبہ نہیں کہ اس نے بہت کچھ اپنی محنت، مطالعہ، ذہانت اور قوتِ حفظ کی بدولت حاصل کیا تھا، جرجی زیدان لکھتا ہے،

"اس کے باپ نے بچپن میں نحو اور لغت سکھائی، پھر اس نے اپنے شہر کے لوگوں سے تعلیم پائی، جب ۲۰ سال کا ہوا تو علوم و آداب کی طرف اسے خود توجہ ہوئی، اور اس نے اپنے مطالعہ، محنت اور کوشش سے انھیں حاصل کیا، اس کے یہاں جو لوگ رہتے تھے وہ

---

۱ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۲ ص ۲۶۰ ۲ تاریخ ابوالفداء ج ۲ ص ۱۷۶

اس کے سامنے کتابیں اور عربوں کے اشعار و واقعات سناتے تھے جنھیں وہ حفظ کر لیتا تھا، اس کا حافظہ اتنا قوی اور غیر معمولی تھا کہ بمشکل اس کا یقین کیا جا سکتا ہے[1]"

اس کا بڑا ثبوت خود اس کا یہ بیان ہے :-

ومنان فارقت العشرین من العمر ما حدثت نفسی باجتداء علم من عراقی ولا شامی من یھد اللہ فھو المھتدی ومن یضلل فلن تجد لہ ولیا مرشدا والذی اقدمنی تلک البلاد مکان دار الکتب بھا[2]"

تلامذہ | تذکرہ اور تراجم کی کتابوں میں اس کے صرف دو چار شاگردوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کے شاگردوں کی تعداد اتنی کم نہیں، جس کے کئی ثبوت ہیں،

(۱) ابن خلکان وغیرہ نے اسکے دو شاگردوں کا نام لینے کے بعد (وغیرھما) اور سیوطی نے ۳ شاگردوں کا ذکر کرنے کے بعد (وخلق) اور علامہ سمعانی نے ۵ شاگردوں کی تصریح کرنے کے بعد (وجماعۃ کبیرۃ) کے الفاظ تحریر کیے ہیں، جو تلامذہ کی کثرت کا ثبوت ہے،

(۲) جب وہ بغداد سے اپنے وطن آیا تو اس کے گھر پر طلبہ اور شائقین علم کا اژدحام رہتا تھا اس کے سوانح نگاروں کا بیان ہے :

وسار الیہ الطلبۃ من الآفاق	اس کے پاس ایک دنیا سے طلبہ آتے اور
وکاتبہ العلماء والوزراء	علماء، وزراء اور اصحاب قدر و منزلت
واھل الاقدار[3]	اس سے مراسلت کرتے تھے،

جرجی زیدان کا بیان ہے کہ

"لوگ اس کے پاس آکر اس کے اقوال و اخبار سنتے، خطوط کے ذریعہ اس سے (علمی مسائل)

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۶۰ [2] رسائل ص ۳۲ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۹۵ [5] مرآۃ الجنان ج ۳ ص ۷۸ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۸۱

میں استفسار کرتے اور مفت تعلیم حاصل کرتے" (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۶۱)

ابن عدیم نے لکھا ہے کہ اس سے علم حاصل کرنے والوں میں معرہ، حلب، کفر طاب، اندلس تبریز، اصبہان، سروج، رقہ، ہکار، بغداد، مصیصہ، ابہر، انبار اور نیشاپور وغیرہ کے علماء، امراء، ادباء، محدثین اور قضاۃ سبھی ہوتے تھے، ایک ایرانی سیاح کا بیان ہے کہ دو سو سے زیادہ آدمی ہر وقت اس کے دروازہ پر موجود رہتے، جو اس سے شعر و ادب کی کتابیں پڑھتے تھے[1]"

اس کے انتقال کے بعد تقریباً ۸۴ شاعروں نے اس کا مرثیہ کہا، جن میں سے اکثر و بیشتر اس کے شاگرد تھے۔ (معجم الادباء ج ۱ ص ۱۷۱)

(۳) اس زمانہ کے عام حالات و واقعات پر اگر غور کیا جائے تو اس کے شاگردوں کی اس مختصر تعداد پر حیرت ہوتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں علمی شوق عام تھا، شائقین علم دور دراز سے مشقتیں اٹھا کر اہل علم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے تھے، ایسی صورت میں ابو العلاء جیسے یگانۂ روزگار فاضل کے تلامذہ کی قلت تعداد قابل یقین نہیں ہے، اس سلسلہ میں اس کے ایک مشہور شاگرد خطیب تبریزی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، ان کے تبریز سے ابو العلاء کے پاس معرہ آنے کی تقریب یہ ہوئی کہ انھیں مشہور امام لغت ابو منصور ازہری کی کتاب التہذیب دستیاب ہوئی، تو اس کے مباحث کی تحقیق کے لیے ان کو کسی کامل الفن لغوی کی تلاش ہوئی، لوگوں نے ابو العلا معری کی نشاندہی کی، خطیب میں سواری کی وسعت نہ تھی، اس لیے وہ بڑی مشقت اٹھا کر تبریز سے معرہ پیدل آئے، (الوافی بالوفیات ج ۲ ص ۲۳۳) اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں۔

[1] بحوالہ ابو العلاء و ما الیہ ص ۲۰۹-۲۱۰

(۴) ابو العلاء کا خود بیان ہے کہ بغداد سے معرہ واپس آنے کے بعد میں نے بہت چاہا کہ خلوت اور گوشہ گیری کی زندگی بسر کروں، لیکن طلبہ کے ہجوم کی وجہ سے میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی،

ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو العلاء کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، مولانا عبد العزیز میمن نے تلاش و تفحص کے بعد اس کے ۳۵ شاگردوں کے نام اور مختصر حالات تحریر کیے ہیں،

نابینائی | ابو العلاء نابینا تھا، اسی لیے اپنے کو رہن المحبسین کہتا تھا، ابو الحسن دلفی مصیصی اسکے حوالہ سے بیان کرتے ہیں،

انا احمد الله علی العمی کما یحمده — میں نابینا ہونے پر خدا کا اسی طرح شکر گذار ہوں

غیری علی البصر[1] — جس طرح لوگ بینا ہونے پر خدا کے شکر گذار ہوتے ہیں"

اپنے متعدد شعروں میں بھی اس نے اپنے نابینا ہونے کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں یہ امر قابل تحقیق ہے کہ وہ کس عمر میں اندھا ہوا تھا،

اکثر مورخین اور اصحاب سیر کے بیان کے مطابق وہ بچپن میں اندھا ہوا تھا، لیکن ابو الفداء اور ابن عماد نے "قیل" کہکر اس کے پیدائشی اور مادر زاد اندھے ہونے کا ذکر کیا ہے، یعنی ان دونوں کے نزدیک بھی صحیح پہلا قول ہے، ابو الفداء کا بیان ہے

"اس کے اندھے ہونے کے زمانہ میں اختلاف ہے، صحیح قول یہ ہے کہ وہ بچپن میں چیچک سے اندھا ہوا تھا[2]"

ابن الانباری نے مادر زاد اندھا ہونے کی تردید کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"وہ اندھا ضرور تھا لیکن مادر زاد نہیں جیسا کہ ناواقف لوگوں کا گمان ہے[3]"

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مادر زاد اندھا نہ تھا، اس سلسلہ میں یہ بھی قابل تحقیق ہے کہ

[1] تتمہ یتیمۃ الدہر ج ۱ ص ۹ [2] تاریخ ابو الفداء، جلد ۲ ص ۱۶۷، [3] نزہۃ الالباء ص ۴۲۵

اندھا ہونے کے وقت اس کی عمر کیا تھی؟

ایک[1] جماعت کے نزدیک تین سال کی عمر میں اس کو چیچک نکلی اور وہ اندھا ہوگیا، دوسری[2] جماعت کے نزدیک چار سال کی عمر میں اندھا ہوا تھا، ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب وہ سات سال کا ہوا تو آنکھوں کی روشنی جاتی رہی[3]، لیکن یہ اختلافات چنداں لائق التفات نہیں،

حلیہ | وہ نہایت بدشکل تھا، چہرے پر چیچک کے داغ تھے، آنکھیں نہایت بدنما تھیں، ایک آنکھ ابھری اور دوسری بیٹھی ہوئی تھی، جسمانی لحاظ سے بھی بہت کمزور، نحیف اور پستہ قد تھا، اس نے اپنے اشعار میں ان تمام عیوب کا ذکر کیا ہے،

تحفو ابا لکلام و اکرمونی — علی ما کان من جسد نحیل[2]

سیر و سیاحت | ابو العلاء گو نابینا اور جسمانی لحاظ سے کمزور تھا، لیکن اس زمانہ کے عام دستور اور شائقین علم کے معمول کے مطابق اس نے بھی متعدد ملکوں کی سیر و سیاحت کرکے وہاں کے فضلاء اور اہل علم سے استفادہ کیا تھا، حسب ذیل ملکوں اور شہروں میں اس کے جانے کا ذکر ملتا ہے،

حلب: اس زمانہ میں علم و فن کا گہوارہ اور سیف الدولہ کی علم و ادب نوازی کی بدولت اصحاب علم و کمال کا مرکز تھا، اس کی کشش ابو العلاء کو بھی وہاں کھینچ لے گئی، اور اس نے یہاں کے ارباب کمال سے استفادہ کیا،

انطاکیہ: لزومیات اور بدیعی کی الصبح المنبی سے انطاکیہ جانے اور وہاں کے مشہور کتب خانہ سے استفادہ کا ثبوت ملتا ہے[3]،

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۷۲، در رضات ص ۴۲، [2] لزوم مالا یلزم ج ۲ ص ۲۰۱ [3] الصبح المنبی ج ۱ ص،

طرابلس میں بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، اور ابو العلاء نے اس سے استفادہ کیا تھا[1]

لاذقیہ۔ یہاں اس نے فلاسفہ کے اقوال معلوم کیے اور ایک دیر کے راہب سے ملاقات کی؛ اس کی باتیں سنیں جس سے وہ شکوک میں مبتلا ہو گیا تھا،[2]

ان شہروں کے علاوہ اس نے اس عہد کے سب سے بڑے علمی و ادبی مرکز بغداد میں بھی قیام کیا تھا، سفر بغداد کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں،

ابن خلکان اور ان کی تقلید میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ دو مرتبہ بغداد گیا، لیکن اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ بغداد گیا تھا، خطیب[3] کی بھی یہی رائے ہے، اور یہی درست معلوم ہوتا ہے،

ابن الانباری کے بیان کے مطابق وہ ایک سال ۹ مہینے[4] اور جمہور کے نزدیک ایک سال سات مہینے بغداد میں رہا،

جن لوگوں کے نزدیک وہ ایک ہی مرتبہ بغداد گیا تھا، ان میں سے اکثر اس کو ۳۹۹ھ کا واقعہ بتاتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے نزدیک دو مرتبہ بغداد گیا، جن میں ابن خلکان بھی ہیں، ان کے قول کے مطابق ۳۹۸ھ کا واقعہ ہے، واپسی کے متعلق تقریباً اصحاب سیر کا اتفاق ہے کہ ۴۰۰ھ میں ہوئی،

قفطی اور ذہبی کا بیان ہے کہ ابو العلاء ایک موقوفہ جائداد پر گذر بسر کرتا تھا، امیر حلب نے اس میں مزاحمت کی۔ اس کی اس زیادتی سے تنگ آکر اس نے بغداد کا رخ کیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مختلف قسم کی اذیتوں حکومت اور ملکی سیاست کے فتنوں سے گھبرا کر وہ وطن چھوڑنے اور بغداد میں قیام کرنے کے لیے مجبور ہوا، خواہ یہ واقعات صحیح ہوں، لیکن ان کو

---

[1] روضات الجنات ص ۷۴، [2] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶، [3] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۰، [4] نزہۃ الالباص ۴۸۷

سفر بغداد کا اصل اور بنیادی سبب نہیں قرار دیا جا سکتا، اس کا اصلی محرک بغداد کی علمی مرکزیت اور وہاں کے علماء اور اصحاب کمال سے استفادہ تھا، ابن وردی کا بیان ہے کہ وہ بغداد تحصیل علم کے لیے اور ابن عدیم کا بیان ہے کہ وہاں کے کتبخانوں سے استفادہ کے لیے گیا تھا۔ اس نے خود بھی لکھا ہے کہ میں نے نہ مال و دولت کے لیے سیاحت کی اور نہ لوگوں سے ملنے کے لیے بلکہ دار العلم میں قیام کرنے اور اہل علم کو ترجیح دیا ہے، (رسائل ص ۳۴)۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ عراق میں فتنہ و فساد مچا ہوا ہے، اور بغداد علم و ادب اور فکر و فن کا مرکز ہے۔ اس لیے میں نے وہاں جانا پسند کیا، (ایضاً ص ۳۰)

بغداد میں اس کی قدر و منزلت بغداد جانے سے پہلے ہی اس کی علمی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی، بغداد والوں کے لیے اس کی شخصیت اجنبی نہ تھی، وہ اس کے علم و فضل سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ جب وہ بغداد پہنچا تو یہاں کے بعض اصحاب علم نے ابو العلاء کا امتحان لینے کی کوشش کی، اور اس کے فضل و کمال کا سب کو اعتراف کرنا پڑا، اور بغداد میں اس کی دھوم مچ گئی، ہر وقت اس کے پاس زائرین کا مجمع رہتا، لوگ اس کے اشعار سنتے اور پڑھتے، وہ بھی یہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں شریک اور فقہاء کے مناظروں، فلاسفہ، علماء اور ادباء کے مباحثوں میں حصہ لیتا تھا، اس زمانہ میں بغداد علم و فن اور تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، ہندوستان سے بھی اس کے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے، اور ہندوستانی علوم بغداد پہنچ چکے تھے، اس لیے یہاں ابو العلاء کو ہندو مذہب اور ہندوستانی فلاسفہ کے خیالات سے آگاہ ہونے کا موقع ملا،

بغداد سے واپسی کا سبب ابو العلاء اپنے وطن کے حالات سے گھبرا کر بڑی تمناؤں کے ساتھ بغداد گیا تھا، لیکن یہاں بھی ایسے حالات پیش آئے کہ اسے بہت جلد واپس آنا پڑا، قدیم مورخین

نے اس کے اسباب نہیں بیان کیے ہیں، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون حد سرقہ پر اپنے بعض اشعار میں اعتراض کیا تھا، فقہاء نے اس کا تعاقب کیا، اس لیے اس کو بغداد سے اپنے وطن آجانا پڑا، [1] لیکن حقیقت میں اس کے اسباب دوسرے ہیں،

وہ حلب کے سیاسی انتشار سے گھبرا کر سکون و اطمینان کے ساتھ علمی زندگی بسر کرنے کے لیے بغداد گیا تھا، مگر بدقسمتی سے یہاں بھی سکون نہ ملا، وہ ایک غیرت مند اور خوددار آدمی تھا، کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، اور نہ علم و ادب کو ذریعہ معاش بنایا، اس لیے وہ اپنے وطن میں بھی تنگ حال تھا، بغداد آنے کے بعد اس کی غیرت اور بڑھ گئی اور یہاں بھی اس کو معاشی اطمینان حاصل نہیں ہوا،

اس کی وحشت اور بیزاری کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ بغداد کے کچھ لوگوں کو اس کی غیر معمولی شہرت و کمال دیکھکر حسد پیدا ہوا، وہ اس کے درپئے آزار ہوگئے، اس سے وہ بہت آزردہ خاطر ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ وہ شریف مرتضیٰ کی مجلس میں گیا، اس سے ایک شخص کو ٹھوکر لگ گئی، اس پر مرتضیٰ نے اس کو کتا کہا، معری نے جواب دیا کہ جسے کتوں کے ستر نام معلوم نہ ہوں وہ کتا ہے، یہ سنکر مرتضیٰ کو حیرت ہوئی، اس نے قریب بلا کر اس کا امتحان لیا، اور اس کے علمی کمال کو دیکھکر اس کی بڑی قدر و منزلت کی، لیکن بعد میں پھر ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا جس کی تفصیل یہ ہے، کہ متنبی کے بارہ میں شریف مرتضیٰ اور ابو العلاء کی رائے میں بڑا اختلاف تھا، ابو العلاء متنبی کا بڑا قدردان اور مداح تھا، اور اسے اس عہد کے تمام شاعروں سے برتر خیال کرتا تھا، اور مرتضیٰ کو اس سے شدید نفرت تھی، ایک مرتبہ اس کی مجلس میں متنبی کا ذکر ہوا، اس نے اس کی مذمت اور اس کے عیوب بیان کرنا شروع کیے،

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۷۳

اس مجلس میں ابو العلاء بھی موجود تھا، اس نے کہا متنبی کا صرف وہ قصیدہ جسکا ایک مصرعہ

ع لکِ یا منازل فی القلوب منازل ۔ ہے، اس کے فضل و شہرت کے لیے کافی ہے،

یہ سنکر مرتضیٰ بہت برہم ہوا، اور ابو العلاء کو گھسیٹ کر مجلس سے نکلوا دیا، اور حاضرین سے کہا کہ متنبی کے اس سے بہتر قصیدے بھی موجود ہیں، لیکن اس اندھے نے اس قصیدہ کا اس لیے ذکر کیا ہے، کہ اس میں یہ شعر بھی ہے:۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص ۔ فھی الشھادۃ لی بانی کامل [1]

میرے کامل ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ کوئی ناقص شخص تم سے میری مذمت کرے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ابو العلاء، ابو الحسن علی بن عیسیٰ ربعی کے یہاں گیا، اور اندر آنے کی اجازت چاہی، ابو الحسن نے کہا اصطبل کو آنے دو، اس پر ابو العلاء غضبناک ہو کر واپس چلا آیا، اور پھر کبھی اس کی مجلس میں نہیں گیا، [2] شامی زبان میں اصطبل اندھے کو کہتے ہیں،

اس طرح کے اور بھی دل آزار واقعات پیش آئے، جن کو ابو العلاء کی حساس اور غیرت مند طبیعت برداشت نہ کر سکی، اور اس کا دل نہ صرف بغداد بلکہ ایک حد تک دنیا سے بھی بیزار ہو گیا، اور اس نے کامل عزلت نشینی کا عزم کر لیا، اس زمانہ میں اس کو اپنی والدہ کی علالت کی اطلاع ملی، اس لیے اس نے رخت سفر باندھ لیا، لیکن اس کو بغداد چھوڑنے کا شدید قلق تھا جس کا اظہار اس نے اپنے خطوط [3] اور شعروں میں کیا ہے، اہل بغداد کے بڑے طبقہ کو اس کے وہاں سے چلے جانے کا سخت افسوس تھا،

والدہ کی وفات ابھی ابو العلاء راستہ ہی میں تھا کہ اس کو ماں کی وفات کی اطلاع ملی، اس سے وہ بہت متاثر ہوا، اور اپنے رنج واندوہ کا اظہار اس نے اپنے مرثیوں اور خطوط میں کیا ہے،

[1] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۷۰، [2] ایضاً ص ۱۶۹ [3] رسائل ابو العلاء ص ۳۰

یہ حادثہ اس کے لیے اتنا جانکاہ ثابت ہوا کہ اس کے بعد اس نے بالکل عزلت نشینی اختیار کرلی، اور دنیا کے تمام عیش وعشرت کو خیرباد کہدیا۔

والدہ کی وفات سے بہت پہلے ۳۷۷ھ میں جب وہ چودہ سال کا تھا، اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، اس عمر میں بھی اس نے والد کا مرثیہ کہا تھا۔

عزلت اور گوشہ گیری بغداد سے واپسی کے بعد اس نے اپنے وطن میں عزلت نشینی اختیار کرلی تھی، لیکن طلبہ اور استفادہ کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے وہ تنہائی کی زندگی نہیں بسر کرسکا، مگر گھر سے نکلنا بند کردیا تھا، اور تمام دنیاوی علائق سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور دنیاوی عیش وتنعم کے سارے اسباب ووسائل بالکل ترک کردیے تھے، اس کے کئی اسباب تھے۔

۱- وہ فطرۃً عزلت نشین اور خلوت پسند تھا

۲- بچپن میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی جس سے وہ اکثر محجوب رہتا، بھری بزم میں جب اس سے کوئی غلطی ہوجاتی تو یہ لوگوں کے مذاق وتمسخر کا نشانہ بنتا، اس سے اسکی حساس طبیعت بہت متاثر ہوتی، اس لئے اس نے یہ طے کرلیا کہ وہ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کردیگا، تاکہ لوگوں کو اس کی کمزوریوں پر ہنسنے کا موقع نہ ملے، یہانتک کہ وہ لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے بھی احتراز کرتا تھا، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ اپنے گھر کے ایک غار میں تنہائی کی حالت میں کھانا کھاتا تھا، اور کہتا تھا کہ اندھے پن کو شرمگاہ کی طرح مستور رکھنے کی ضرورت ہے۔

۳- وہ فلاسفہ اور حکماء کے خیالات سے متاثر اور خود بھی ایک بالغ نظر فلسفی تھا اس لیے ہر چیز کے اسرار واسباب سے بحث اور ان میں غور وفکر کیا کرتا تھا، اور اس کے لیے خلوت اور تنہائی کی ضرورت تھی، اور بعض فلاسفہ کی طرح عزلت گزینی اور خلوت نشینی اس کا مسلک بن گیا تھا۔

فضل وکمال ابو العلاء کا ننہال اور دادھیال دونوں فضل وکمال اور علم وادب کا گہوارہ تھا، لیکن وہ فطرۃً بھی نہایت ذہین وطباع اور صاحب مذاق تھا، قدرت نے اگرچہ اسکی ظاہری آنکھوں کو بے نور لیکن ذہن ودماغ کی بصارت کو روشن کردیا تھا، اور حصول کمال وجامعیت کے تمام اسباب اس کے لیے مہیا کردیے تھے، اور اس کے کمالات پر تمام اصحاب علم کا اتفاق ہے۔

علامہ ثعالبی ابو الحسن دلفی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ "میں نے معرۃ النعمان میں ایک نہایت عجیب وغریب اور حیرت انگیز بات دیکھی کہ ایک اندھا اور ظرافت پسند شاعر شطرنج اور نرد کھیلتا ہے، اور اسے ہر فن میں دخل اور مہارت ہے"۔[1]

یاقوت اور سیوطی لکھتے ہیں:-

"وہ بڑا صاحب فضل مشہور روزگار، وسیع العلم، عاقل وفرزانہ، لغت وزبان کا ماہر، نحو کا حاذق، اچھا شاعر اور بہترین انشاپرداز ہے، اور اس کا فضل وکمال توصیف سے بالاتر ہے"۔[2]

مشہور ادیب اور ابو العلاء کے معاصر ابو الحسن علی باخرزی لکھتے ہیں،

"وہ ایک اندھا لیکن جامۂ فضل وکمال میں ملبوس اور بے مثال ادیب ہے، اس کا شدید ترین مخالف بھی اس کے سامنے شرمندہ، عاجز اور بے دلیل ہوجاتا ہے"۔[3]

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں:-

"ادیب وانشاپرداز معری کا علم وفضل محتاج بیان نہیں"۔[4]

ابن خلکان رقمطراز ہیں:-

"وہ تمام علوم وفنون میں کامل اور ماہر تھا"۔[5]

علامہ ابن جوزی جیسے بزرگ کو جو عقیدہ وخیال کی بنا پر اس کے شدید مخالف ہیں، یہ اعتراف

---

۱ تتمہ یتیمۃ الدہر ص ۹ ۲ معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۲ وبغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶ ۳ دمیۃ القصر ص ۵۰ ۴ کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۲۲۲ ۵ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۸

کرنا پڑا کہ

"اس کے اشعار بہت ہیں، اور اس نے لغت میں تصنیفات املا کرائیں، اس فن میں وہ یکتا تھا۔"[1]

اس قسم کے بہت سے اعترافات کتابوں میں مذکور ہیں، اس کی فضیلت اور ناموری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مختلف علوم کے شایقین اور طلبہ ہر وقت اس کے گرد جمع رہتے تھے، علماء، وزراء اور اصحاب اختیار خطوط لکھکر اس سے استفادہ کرتے تھے،

ابو العلاء اپنی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہوگیا تھا، اس کے معاصر ابن القارح کا بیان ہے قد شاع فضله فی جمیع البشر وصار غرة علی جبهة الشمس والقمر خلد ذلک فی بدائع الاخبار وکتب بسواد اللیل علی بیاض النهار

ابو العلاء کی شخصیت بڑی جامع تھی، وہ متعدد علوم و فنون میں کامل درک رکھتا تھا، نحو ادب، لغت، شعر اور فلسفہ کا تو امام تھا، ان علوم میں کم لوگ اس کے حریف تھے، مورخین اور اصحاب تذکرہ اس کو اللغوی، النحوی، الشاعر المشهور، الفیلسوف، الادیب، شیخ الادب وافر الادب، غزیر الادب، واسع الاطلاع علی اللغة، عالماً باللغة، جید الشعر، حسن الشعر، حاذقاً بالنحو اور الحکیم وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں، جرجی زیدان لکھتا ہے،

وکان معدوداً من اقطاب العلم والادب والشعر (ج ۲ ص ۲۶۱)

حافظہ ابو العلاء کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت بے مثال تھی، ایک مرتبہ جس بات کو سن لیتا یا معلوم کر لیتا وہ اس کے ذہن سے کبھی محو نہ ہوتی، اپنی تمام کتابیں حافظہ سے املاء کراتا تھا، ابن عدیم کا بیان ہے کہ اس نے ایک شب میں اپنے دیوان لزومیات کے دو ہزار شعر نقل کرائے اس کے حافظہ کے ایسے ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کو باور کرنا مشکل ہے،

[1] المنتظم ج ۸ ص ۱۸۴

ابو العلاء کے مشہور شاگرد ابو زکریا تبریزی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ ابو العلاء سے استفادہ کے لیے معرہ آئے تو دو سال تک ان کی اپنے وطن کے کسی آدمی سے ملاقات نہ ہوئی، ایک دن مسجد میں وہ ابو العلاء سے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے، کہ ان کا ایک ہموطن مسجد میں نماز پڑھنے آیا اس کو دیکھ کر ان کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا، ابو العلاء نے سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ دو سال کے بعد آج ایک ہم وطن نظر آیا ہے، اور ابو العلاء کے سامنے دونوں میں باتیں ہوئیں، ابو العلاء نے پوچھا تم دونوں نے کس زبان میں گفتگو کی، ابو زکریا نے بتایا کہ آذربائیجان والوں کی زبان میں، معری نے کہا میں اس زبان سے ناواقف ہوں، اس لیے تمھاری باتیں تو نہیں سمجھ سکا لیکن اسکے الفاظ مجھے یاد ہو گئے، اور گفتگو کے پورے الفاظ نقل کر دیے، یہ دیکھکر دونوں سخت متحیر ہوئے،[1]

یاقوت حموی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے، "یہ بلا کی قوت ہے، اس سے بہتر یادداشت کی کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔"[2]

صبح منبی میں متنبی کے غیر معمولی حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً لکھا ہے:۔

اسی طرح کا غیر معمولی اور قوی حافظہ ابو العلاء معری کا بھی تھا، اسامہ بن منقذ بیان کرتے ہیں کہ انطاکیہ کے کتب خانہ کے نگراں کے یہاں میں گیا تو اس نے کہا کہ میرے یہاں ایک ایسی عجیب چیز ہے، جس کی مثال تاریخوں ہی میں مل سکتی ہے، ایک نابالغ اور اندھا لڑکا کتب خانہ میں آیا کرتا ہے، اس نے چند روز میں کئی کتابیں یاد کر لی ہیں، میں صرف ایک بار اس کے سامنے پڑھتا ہوں، وہ مجھ سے محض اس چیز کو دریافت کرتا ہے جس میں اس کو کچھ شبہہ ہوتا ہے، وہ ایک مرتبہ سنکر اس کو دہرا دیتا ہے، یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ لڑکا آگیا

[1] کتاب الانساب ورق ۱۱۱ [2] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۴

وہ نہایت بدصورت، چیچک رو اور اندھا تھا لیکن ذہانت اس کے بشرہ سے عیاں تھی،

اسے دیکھکر لائبریرین نے کہا عمرت عمرہ از باد، ابھی میں ان صاحب سے تمہارا ذکر ہی کر رہا تھا، انکی خواہش ہے کہ جس چیز کو وہ کہیں تم اسے یاد کر کے سناؤ، لڑکے نے جواب دیا آپ کا حکم سر آنکھوں پر، چنانچہ میں نے ایک مشکل چیز منتخب کر کے اس کے سامنے پڑھی، جو بات اسے کھٹکتی اسکا اعادہ کراتا، ایک جزء سے زیادہ میں نے اس کے سامنے پڑھا تھا، اسے سنکر اس کو پورا دہرا دیا، یہ دیکھکر میں دنگ رہ گیا، اور اپنے دل میں کہا

این سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناظر کتب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ابو العلاء معری ہے۔[1]

اس سے زیادہ دلچسپ اور عجیب حکایت اس کا ایک شاگرد بیان کرتا ہے، ابو العلاء کے پڑوس میں ایک عجمی رہتا تھا، ایک دن وہ معرہ سے باہر کہیں گیا ہوا تھا کہ اس کے وطن سے ایک آدمی آیا، ہموطن کو نہ پاکر ابو العلاء سے فارسی زبان میں کچھ پیغام دیکر چلا گیا، ابو العلاء فارسی زبان نہیں جانتا تھا لیکن تمام الفاظ اس نے حفظ کر لیے، اور پڑوسی کے واپس آنے کے بعد اس کے سامنے دہرا دیے، وہ ان کو سنکر رونے پیٹنے اور سر دھننے لگا، ابو العلاء نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے باپ، بھائی اور کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے،[2]

ابو العلاء کے اصحاب بیان کرتے ہیں کہ اس کے پڑوس میں ایک آدمی گھی کی تجارت کرتا تھا، اور معرہ کے ایک آدمی سے اس کی معاملت رہا کرتی تھی، ایک دفعہ پڑوسی نے اس شخص سے حساب کتاب کا پرچہ لکھایا، ابو العلاء اپنے کمرہ سے اس کو سن رہا تھا، کچھ دنوں بعد اس کو مضطرب اور پریشان دیکھکر اس کا سبب پوچھا، معلوم ہوا کہ وہ پرچہ کھو گیا ہے اور

[1] الصبح المنبی بشرح عکبری لدیوان المتنبی ج اول ص ۷ تا ۹ [2] ایضاً ص ۱۰

حساب یاد نہیں رہا، ابو العلاء نے کہا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم کو پورا حساب لکھائے دیتا ہوں، کچھ دنوں کے بعد اصل دستاویز مل گئی، اس سے ابو العلاء کی تحریر کا مقابلہ کیا گیا تو وہ ٹھیک اسی کے مطابق نکلی،[1]

ایک یمنی کے پاس لغت کی ایک کتاب تھی، جس کا ابتدائی حصہ پھٹ گیا تھا، متعدد اہل علم سے دریافت کرنے پر بھی کتاب اور مصنف کا نام نہیں معلوم ہو سکا، ابو العلاء کے پاس یہ کتاب لائی گئی تو اس نے دونوں کا نام اور ضائع ہونے والے حصہ کا املا کرا دیا،[2]

اس قسم کے اور بھی بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات بیان کیے جاتے ہیں ممکن ہے ان میں کچھ مبالغہ بھی ہو، لیکن اس کی قوت حفظ بہر حال مسلّم ہے، مبالغہ آمیز واقعات بھی اسی وقت منسوب کیے جا سکتے ہیں جب اس میں کچھ حقیقت ہو، حافظ ذہبی کا بیان ہے

"یقال عنہ انہ کان یحفظ ما یمر بسمعہ"

ذکاوت و فطانت

حافظہ کی طرح اس کی ذہانت بھی حیرت انگیز ہے، وہ اپنے دور کا عبقری تھا، مورخین اور اصحاب سیر کا اس کی ذکاوت پر اتفاق ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: وکان فی غایۃ الذکاء المفرط، حافظ ابن حجر کا خیال ہے وکان عجبا من الذکاء المفرط۔ ذہبی نے صاحب الذکاء المفرط، یاقوت اور سیوطی نے غایۃ فی الفہم، [illegible] نے المشہور بالذکاء۔ علامہ بدیعی نے یتوقد ذکاء اور ابن عدیم نے متوقد الخاطر علی غایۃ من الذکاء تحریر کیا ہے،

اس کے ذہن و طباع ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے ۱۱ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، اور ۱۵-۲۰ سال کی عمر میں ایک اچھے اور باکمال شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا،

[1] الصبح المنبی ص ۱۲ [2] ذکری ابی العلاء ص ۲۲۲

اور اسی زمانہ میں اس نے اپنا دیوان سقط الزند بھی مرتب کر لیا تھا، شاعری کے علاوہ جملہ متداول علوم میں اس نے بیس سال کی عمر میں کمال حاصل کر لیا تھا، اس اعتبار سے اس کا یہ قول: وانی کنت الاخیر زمانہ لآت بما لم تستطعہ الاوائل

صرف شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔

تفریحات سے دلچسپی | ابو العلاء کی ذہانت و طباعی صرف علمی و ادبی دائرہ تک محدود نہ تھی، شروع میں اس کو مذاق و تفنن اور لطف و تفریح سے بھی دلچسپی تھی، اس میں بھی وہ اپنی ذہانت و طباعی کے جوہر دکھاتا تھا، ثعالبی نے ابو الحسن دلفی کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ میں نے ایک اندھا اور ظریف شاعر دیکھا، جو شطرنج اور نرد کھیلتا، اور جدل و ہزل ہر قسم میں دخل رکھتا ہے[1]، یاقوت نے بھی یہ روایت نقل کی ہے، اور دوسرے مورخین کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شطرنج اور نرد بہت اچھی طرح کھیلتا تھا، جرجی زیدان کا بیان ہے کہ اندھے ہونے کے باوجود وہ اپنے ہم مذاق لوگوں کے مشغلوں اور لطف و تفریح میں شریک ہوتا، اور ان میں ان سے مقابلہ و مسابقت کرتا، نرد و شطرنج نہایت عمدہ کھیلتا تھا، لیکن ڈاکٹر طہٰ حسین نے ابو العلاء کے اندھے ہونے کی بنا پر شطرنج کھیلنے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے،

فیاضی و سیر چشمی | ابو العلاء کی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی، اکثر فقر و عسرت میں بسر کرتا تھا، لیکن دل غنی اور طبیعت فیاض تھی، اور اپنی استطاعت کے مطابق لوگوں کی مدد کرتا اور دوستوں کے پاس ہدیے اور تحائف بھیجتا، اس کے یہاں طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا، لیکن کسی سے کوئی معاوضہ یا امداد قبول نہ کرتا تھا، اور اپنی ناداری کے باوجود خود ان پر

[1] تتمہ یتیمۃ الدہر ص ۹

کچھ نہ کچھ خرچ کر دیتا تھا، ایک مرتبہ اس کے شاگردوں نے حلب کے خربوزوں کی تعریف کی، تو اس نے ایک آدمی بھیجکر خربوزے منگائے اور انھیں کھلایا[1]۔

دوسروں کی حاجت روائی | وہ طبعاً عزلت پسند تھا، عام لوگوں سے اس کا زیادہ ربط و تعلق نہ تھا، لیکن شائقین علم، امراء و اعیان و دولت سے اس کے علمی تعلقات تھے۔ وہ اس کا بڑا احترام کرتے تھے، اس لیے اکثر ضرورتمند اس سے سفارش کے خواہشمند ہوتے، وہ سفارش کر کے ان کی حاجت روائی کرتا تھا،

عام معمولات | وہ ایک خاموش اور خلوت پسند آدمی تھا، اس لیے ہنگاموں اور سیاسی و ملکی شورشوں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی، موٹا جھوٹا کھاتا اور پہنتا اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا، دن میں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا کام انجام دیتا اور رات غور و فکر، علمی مسائل میں مذاکرہ اور یاد الٰہی میں بسر کرتا، اور ان سے فارغ ہونے کے بعد سوتا، فواحش و منکرات اور بیحیائی کے کاموں سے اس کو کوئی رغبت نہ تھی،

شہرت سے بے نیازی | ابو العلاء خالص علمی و ادبی اور فلسفیانہ مذاق رکھتا تھا، طبعاً بھی عزلت اور خاموشی پسند کرتا تھا، اور گوشۂ عزلت میں زندگی بسر کرتا تھا، لیکن اس کے کمالات اور علم و فضل نے اسے عوام و خواص میں مشہور و مقبول بنا دیا تھا، طلبہ اور شائقین علم کا اس کے یہاں ازدحام رہتا تھا، علماء میں بھی مقبول تھا، اور وزراء و سلاطین کی نگاہ میں بھی اس کی عزت و عظمت تھی، بغداد سے رخصت ہوتے وقت وہاں کے لوگوں نے جس تعلق اور محبت کا اظہار کیا، وہ اس کی مقبولیت کی دلیل ہے، وہ خود لکھتا ہے: "اللہ تعالیٰ اہل بغداد کو جزائے خیر دے، انھوں نے میری تعریف کی، میں اس کا مستحق نہ تھا، بے علم ہونے کے باوجود انھوں نے میرے فضل کا اعتراف کیا[3]"

[1] ذکری ابی العلاء ص ۲۱۶ [2] بحوالہ تاریخ الحکماء قفطی [3] رسائل ص ۳۵

اس کے حاسدین اور مخالفین کو بھی اعتراف تھا کہ قد شاع فضلہ فی جمیع البشر۔

خود اس کا بیان ہے کلمات رغبت فی الخمول قدر لی غیر المامول[1]

عمر اور صحت ابو العلاء نے ۸۶ سال کی عمر پائی، اور زندگی بھر صحت مند رہا، جو اس کے تجرد، آسائیش اور لذائذ سے کنارہ کشی، قناعت اور سادہ زندگی کا نتیجہ تھا، بڑھاپے میں جب قوی کمزور ہو گئے تھے، ہوش و حواس، قوائے فکریہ اور اصابت رائے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا، ۴۰ - ۵۰ سال کی عمر میں دانت ٹوٹ گئے، بڑھاپے میں بالوں کی سیاہی ختم اور سماعت کم ہو گئی تھی، وہ طویل عمر اور زیادہ بڑھاپے سے بہت گھبراتا تھا، لیکن قدرت نے اس کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی،

وفات ۱۳ ربیع الاول ۴۴۹ھ کو جمعہ کے دن معرۃ النعمان میں تین دن کی علالت کے بعد ۸۶ سال کی عمر میں انتقال کیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قبر پر یہ شعر لکھنے کی وصیت کی تھی،

هذا جناه ابی علی　　　وما جنیت علی احد

بعض سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ ابو العلاء کی وفات کے بعد اس کی قبر پر ایک ہفتہ کے اندر دو سو مرتبہ قرآن مجید ختم کیا گیا، تبریزی کا بیان ہے کہ ۸۴ شاعروں نے مرثیے لکھکر اس کی قبر پر پڑھے، ابو الحسن علی بن ہمام کے مرثیہ کا یہ شعر مشہور ہے:

ان کنت لم ترق الدماء زهادة　　　فلقد ارقت الیوم من جفنی دما[2]

اگرچہ تم نے زہد کی بنا پر (زندگی بھر) کبھی خون نہیں بہایا لیکن آج (مرنے کے بعد) میری آنکھوں سے خون کے آنسو بہا رہے ہو۔

شاعر حلب ابو الفتح کا مرثیہ بھی مشہور ہے، اس کا پہلا شعر ہے:

العلم بعد ابی العلاء مضیع　　　والارض خالیة الجوانب بلقع[3]

ابو العلاء کے بعد علم ختم اور زمین ویران ہو گئی۔

---

[1] رسالہ غفران ص ۱۹۲ [2] ابن خلکان ج ۱ ص ۶۰

ابن وردی کا بیان ہے کہ ابن قیروانی متوفی ۵۴۳ھ معرہ گئے، تو ابو العلاء کی قبر پر یہ شعر کہا:

نزلت فزرت قبر ابی العلاء　　　فلم ار من قری غیر البکاء

الا یا قبر احمد کم جلال　　　تضمنہ ثراک وکم ذکاء

میں ابو العلاء کی قبر پر گیا تو سوائے آنسو کے اور کوئی سامان ضیافت نہ تھا، ابو العلاء کی قبر کتنا جلال و عظمت اور کیسی ذکاوت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔

علاء الدین علی بن مظفر کندی ربیع الاول ۶۷۹ھ میں اس کی قبر پر گیا، تو وہ زمین کے برابر ہو چکی تھی، اور اس کے آثار اور وصیت کے شعر معدوم ہو چکے تھے، انھوں نے یہ دو شعر اس پر تحریر کیے:

قد زرت قبر ابی العلاء المرتضی　　　لما اتیت معرة النعمان

وسألت من غفر الخطایا انه　　　یهدی الیه رسالة الغفران[1]

ابو العلاء کی قبر مدتوں ویران و پامال رہی، ابن خلکان، قفطی اور ذہبی جو مختلف زمانوں میں اس قبر پر گئے ہیں، اس کی ویرانی کا ذکر کیا ہے، امیر نورس پاشا نے اپنے زمانہ میں اس کی مرمت کرا کے یہاں ایک مکتب قائم کیا، اور اب شہر کے گوشہ ہی میں ایک شاندار قبر بن گئی ہے، اس پر قدیم خط کوفی میں ایک کتبہ تحریر ہے، اس کے پاس ہی اس کے ایک شاگرد اور شیخ محمد غباری کی قبریں ہیں جس کی زیارت کے لیے لوگ جاتے ہیں۔[2]

(باقی)

---

[1] بحوالہ ابو العلاء وما الیہ ص ۲۵۵ [2] معجم المطبوعات ج اول ص ۳۲۰

سیتاپور کے کتبخانے
اور
ان کے بعض نوادر

از جناب نادم سیتاپوری

سیتاپور (اودھ) اور اس کے مضافات صدیوں علم و ادب کے مرکز رہے، مخدوم شیخ سعدالدین (المتوفی ۹۱۲ھ) کے پہنچنے کے بعد "خیرآباد" تو "مدینۃ الاولیاء" بننا شروع ہی ہوگیا، لیکن ہرگام اور لاہرپور اس سے پہلے ہی "سلسلہ قلندریہ" سے منسلک ہو چکے تھے، "صدرپور" کے علامہ فہامی اگرچہ عہد شاہجہانی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کا کتب خانہ اس زمانے میں اودھ کا ایک بہترین کتب خانہ تسلیم کیا گیا ہے، جو شاہجہاں نے انھیں عطا فرمایا تھا، مشہور ہے کہ کئی ہزار مخطوطات بڑے بڑے چوبی صندوقوں میں محفوظ کر کے چھکڑوں پر دلی سے صدرپور لائے گئے تھے، مگر آج کنکر کی اینٹوں سے بنے ہوئے اس قلعہ کے تہ خانوں میں مٹی کے ڈھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں، لاہرپور کی خانقاہ "قلندریہ" میں عربی اور فارسی مخطوطات کا جو بیش قیمت ذخیرہ آج بھی کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے، اب سے چند سال قبل تک بڑی اچھی حالت میں تھا، شاہ ولایت احمد صاحب مرحوم ایک بزرگ سیرت عالم تھے، جنھیں کتابوں سے والہانہ عشق تھا، جب تک زندہ رہے اس کتب خانے کے ایک ایک ورق کو سینے سے لگائے رہے۔

خیرآباد کے عظیم الشان کتب خانوں میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا کتب خانہ انقلاب ۵۷ء

ہی میں تباہ ہو چکا تھا، پھر بھی خیرآباد میں چھوٹے چھوٹے کئی کتب خانے اور بھی تھے، جن میں حکیم انوار حسین مرحوم کا کتب خانہ سب سے زیادہ اہم تھا، قدیم طبی مخطوطات کے علاوہ ادب، تصوف، تاریخ، فلسفہ اور منطق کے ایسے ایسے نوادر اس کتب خانے میں موجود تھے کہ شاید ہی کہیں ہوں، علامہ فضل امام خیرآبادی کی "تاریخ ہند" کا منفرد نسخہ اب بھی اس خاندان میں موجود ہے،

خاص سیتاپور میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے کتب خانے تھے، جن میں سب سے زیادہ گراں بہا لائبریری مترجم "اخوان الصفا" علامہ سیتاپوری مولوی اکرام علی مرحوم کی تھی، علامہ سیتاپوری میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر بہادر علی حسینی وغیرہ کے معاصرین میں تھے، اور ایک مدت تک "فورٹ ولیم" میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے دوش بدوش علم و ادب کی خدمت کرتے رہے، ان کا کتب خانہ ان کے پوتے منشی علی محمد نظم کی حیات تک محفوظ رہا، انکی وفات (۱۹۲۹ء) کے بعد یہ بھی تباہ ہو گیا،

اس کے علاوہ خاص سیتاپور میں غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عباس[1] بیگ خان بہادر، مولوی مظہر علی (تعلقدار مہیوہ) سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (سب جج) حکیم مومن خاں مومن کے داماد مولوی عبد الغنی وکیل[2]، سردار محمد ہاشم خاں، آغا عبد الغنی دہلوی (وکیل سیتاپور)

---

[1] مرزا غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم زوجہ مرزا اکبر بیگ بدخشی کے منجھلے صاحبزادے، غدر ۵۷ء سے قبل سیتاپور آ بسے تھے، خیرخواہی کے صلے میں انگریزوں نے انھیں تعلقہ بڑا گاؤں (ضلع سیتاپور) عطا کیا تھا، ان کے دو دوسرے بھائیوں کی اولاد بھی غدر کے بعد سیتاپور آ گئی تھی، چنانچہ اس خاندان کی ایک شاخ اب بھی یہیں موجود ہے، مرزا عباس بیگ خان بہادر نے ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ [2] مومن کے باقیات الصالحات میں یہی ایک صاحبزادی تھیں جو مولوی عبد الغنی وکیل سیتاپور سے منسوب تھیں، اس سے تیس سال قبل تک مومن کے ایک نواسے عبد الغنی بقید حیات تھے، مومن کی صاحبزادی اور پھر مولوی عبد الغنی وکیل نے سیتاپور ہی میں وفات پائی، یہیں آسودۂ خواب ہیں۔

شاہ محمد صادق مارہروی اور خود میرے خاندان میں مطبوعات و مخطوطات کے بڑے اچھے ذخیرے تھے، سید محمد احمد خاں (سب جج) کی لائبریری اس صدی کے اوائل میں جسٹس سید محمود[1] کے انتقال (۱۹۰۳ء) کے بعد علی گڈھ منتقل ہوگئی تھی، اس کے علاوہ تقریباً اور سب کتب خانے تباہ و برباد ہوگئے، میرے خاندانی کتب خانے میں اب بھی بہت کچھ ہے پھر بھی بہت سے نوادر تلف ہوگئے، خان آرزو کی "موہبت العظمیٰ" کا جو مخطوطہ میرے یہاں ہے، وہ میرے ایک بزرگ میر مددعلی عارف نے خان آرزو کے اصل مسودہ سے نقل کیا ہے، خان آرزو میر مددعلی عارف کے قریبی دوستوں میں تھے، مدتوں دونوں فیض آباد میں ساتھ رہ چکے تھے،

قصبہ آنٹ (ضلع سیتاپور) کے قطب زمان سید شاہ سلطان جہانگیر "صاحب ذکر و فکر" عالم تھے، کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور تصوف کی بے شمار کتابیں ان کے یہاں محفوظ تھیں، مگر یہ کتب خانہ اس خاندان کے سیتاپور منتقل ہونے سے پہلے ہی ختم ہوچکا تھا، قطب زماں نواب افضل خاں (بن علامہ ابوالفضل) صوبیدار بنگالہ کے سمدھی تھے، ان کے صاحبزادے سید شاہ مصطفیٰ کی شادی نواب افضل خاں کی صاحبزادی "اولیا بی بی" کے ساتھ ہوئی تھی جن کی نسل اب بھی سیتاپور میں موجود ہے،

چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں اس ضلع کے ہندو اور مسلمان زمینداروں اور تعلقداروں کے یہاں علوم مشرقی کے بڑے اچھے ذخیرے تھے، کملاپور کے ٹھاکر جواہر سنگھ، بابوپور کے حاجی محمد احمد خاں مرحوم، "نیری بہ گانواں" کے ٹھاکر صاحبان، مچھریٹہ، باڑی، تمبور،

[1] جسٹس سید محمود کا آخری دور حیات سیتاپور ہی میں گذرا، کئی سال تک انھوں نے یہیں بیرسٹری کی، اپنے حقیقی چچازاد بھائی سید محمد احمد خاں (سب جج) کے ساتھ "بیگم باغ" میں رہتے تھے، ۱۹۰۳ء میں یہیں وفات پائی، لاش علی گڈھ لیجائی گئی، میرے بچپن تک اس خاندان کے کچھ افراد سیتاپور میں موجود تھے۔

اورنگ آباد اور قطب نگر میں مطبوعات کے علاوہ قلمی کتابوں کے ایسے ایسے نادر نسخے موجود تھے، جن کا تذکرہ کرتے ہوئے دل دہلتا ہے،

ہندوستان بھر میں اخبارات و رسائل کا جیسا عظیم الشان کتب خانہ اختر الدولہ[1] کا تھا، غالباً شخصی کتب خانوں میں کہیں اور نہ ہوگا صحافت کا یہ عدیم النظیر کتب خانہ میرے دیکھتے دیکھتے ردی کے بھاؤ بک گیا، اور ہندوستانی صحافت کی سب سے بڑی لائبریری سے اس طرح محروم ہوگیا کہ اب اس کا بدل ممکن ہی نہیں،

ضلع سیتاپور میں سب سے بڑا کتب خانہ ریاست محمود آباد کی لائبریری "سقراط" ہے جس میں کئی ہزار قیمتی مخطوطات اور تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ مطبوعات ہوں گی، اس لائبریری میں قلمی کتابوں کا جیسا نادر ذخیرہ کسی وقت تھا، اور وہ کیا شاید ہی یو.پی میں کہیں اور ہو! خاتمۂ زمینداری کے بعد یہ لائبریری بھی تقریباً برباد ہی ہوچکی ہے،

اب سے تیس پینتیس سال پہلے "بسوان" (ضلع سیتاپور) میں بھی ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، جو بحیثیت کتب خانہ کے تو بہت ہی چھوٹا تھا، مگر اسے نسبت ایک بہت بڑی شخصیت سے تھی، اس عظیم شخصیت سے جو علامہ شبلی کے استاد مولوی محمد فاروق چریاکوٹی مرحوم[2] کے استاد بھائی تھے

[1] اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی گذشتہ صدی کی وہ تاریخی شخصیت ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستانی صحافت اور پریس کی تاریخ اردو زبان میں "اختر شاہنشاہی" کے نام سے لکھی، اس سے قبل ہندوستانی صحافت اور پریس پر کسی زبان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اختر الدولہ سادات سیتاپور کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یہیں پیدا ہوئے اور کم و بیش سو سال کی عمر میں یہیں ۲ جولائی ۱۹۲۹ء کو وفات پائی، "اختر شاہنشاہی" صرف ایک بار اختر الدولہ کے اختر پریس میں جون ۱۸۸۸ء میں چھپی تھی، اب یہ تقریباً کمیاب ہے۔ [2] علامہ فدا حسین اور مولوی محمد فاروق چریاکوٹی دونوں شمس العلماء مفتی محمد عباس لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، (تجلیات مؤلفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، مطبوعہ نظام پریس لکھنؤ،)

ان کا اصل نام "محمد سراج الدین ابن عیش قریشی" تھا، کنیت ابوشہاب، لیکن شہرت پائی اپنے گھریلو نام "شیخ فدا حسین" سے، شیخ زادگان لکھنؤ کے تاریخی خاندان کی آخری یادگاروں میں سب سے جلیل القدر بزرگ تھے، ان کے والد ماجد شیخ فدا علی (عرف اچھے صاحب) عیش لکھنوی میر کلو عرش (خلف میر تقی میر) کے ارشد تلامذہ میں تھے، ایک درجن سے زیادہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، عہد واجد علی میں "خلمۃ اخبار سلطانی" انہی کے سپرد تھا، ۱۳۱۶ھ میں وفات پائی، وہ نسباً شیخ صدیقی لیکن مذہباً شیعہ تھے، سرسید تحریک کے ابتدائی حامیوں میں تھے، ایک مدت تک "اینگلو محمڈن کالج" میں عربی کے پروفیسر تھے، ۱۳/ نومبر ۱۹۳۴ء میں بسوان میں وفات پائی، یہیں سپرد خاک ہوئے، دو درجن سے زاید مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنف تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

(۱) ترجمہ کتاب تمایندس، یہ کتاب افلاطون کی ہے، اس میں مثل افلاطونیہ پر بحث ہے،

(۲) کتاب الاستشاریہ، الٰہیات میں ہے،

(۳) مقدمہ نوریہ، اس میں ثابت کیا ہے کہ عوالم اجسام میں ہر ہر ذرہ کو معرفت الٰہی مجازاً نہیں بلکہ حقیقۃً حاصل ہے، وہ سب اپنے نفس سے ناواقف ہیں، اور خدا کو پہچانتے ہیں،

(۴) اثبات النبوۃ۔ اس کتاب میں عرب کے مشہور فلسفی اسحاق کندی عیسائی کے ایک رسالے کی تردید ہے، جو اس نے خلیفہ مامون عباسی کے مصاحب عبداللہ بن اسمٰعیل ہاشمی کے نام لکھا تھا، یہ کتابیں نامکمل ہیں،

(۵) تقریب الاسناد۔ اس میں مصنف کے اسناد حدیث کی تفصیل ہے،

(۶) سترالمبسر اس میں عام اور متفقہ رائے کے برخلاف اشتر نخعی کی صحابیت کو ثابت کیا ہے،

(۷) دلیل الصادب۔ اس میں مختار ثقفی پر جو مذہبی اور سیاسی الزام لگائے جاتے ہیں، اس کی تردید ہے،

(۸) مجردات عن الموضوعات۔ اس میں بعض ان حدیثوں کو ثابت کیا ہے، جنھیں محدثین موضوع بتاتے ہیں،

۹. کتاب کشف عن الغناء۔ صحاح ستہ اور ان کے بعد حدیث کی جو کتابیں مدون ہوئی ہیں، ان پر متن اور سند دونوں حیثیتوں سے تنقید کی ہے،

(۱۰) یم عجاج۔ اس میں آپ نے شیوخ حدیث کے سلسلۂ اسناد و روایت کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے،

(۱۱) عبرات العینین۔ (مقتل ابن عیش) دو حصوں میں ہے، ہر حصہ میں تین تین ہزار اوراق سے زاید ہیں، پہلے حصے میں حسب اصول علمائے جرح و تعدیل روایات اخبار و احادیث پر گفتگو کی ہے، اور امام ذہبی کا رد کیا ہے، جنھوں نے حضرت امام حسینؑ کی بشارت پر گریہ کی فضیلت کی روایت نقل کرکے اس کی صحت سے انکار کیا ہے اور گریہ کی فضیلت ثابت کی ہے، دوسری جلد میں حضرت امام حسینؑ کے حالات، اہل بیت کے مدینہ سے نکلنے اور پھر دوبارہ واپسی تک جو جو واقعات گذرے ہیں، اس کی تفصیل ہے،

مرحوم اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ سے ترک وطن کرکے "بسوان" ضلع سیتا پور میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، اپنے بچپن اور پھر ہوش میں آنے تک مجھے سیکڑوں بار انکی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، میرے والد ماجد سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، اور ایسے عزیزانہ کہ علامہ کی وفات سے تین مہینے قبل جب میرے والد کا انتقال ہوا تو انھیں مرتے دم تک والد کے سانحۂ ارتحال کی خبر نہیں کی گئی، کیونکہ علامہ پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہو چکا تھا، اور خطرہ تھا کہ اس حادثہ کا ان کی بیماری پر اور برا اثر پڑے گا،

قیمتی

علامہ کے کتب خانے میں عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور ہندی کی جو

کتابیں تھیں، انھیں پڑھنے اور سمجھنے کا شعور تو مجھ میں نہیں تھا، پھر بھی ان کے ڈرائنگ روم اور نچلی کمروں میں بیشمار کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں اب تک میری نگاہوں میں رقصاں ہیں ان کتابوں کی تعداد چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی،

علامہ کی وفات (۱۳۴۴ھ) کے بعد ان کے خلف اکبر ابوالفضل شیخ بادشاہ حسین اس علمی ترکہ کے بھی وارث قرار پائے، "ابوالفضل" اپنے والد کے صحیح جانشین تھے، "سنسکرت" کے اتنے بڑے عالم کہ اس دور کے بڑے بڑے "ودیانت" ان کے سامنے مودب بیٹھتے تھے، فلسفی ایسے کہ ہر وقت استغراق اور محویت کا عالم طاری رہتا تھا، سر مہاراجہ محمود آباد کی حقیقی بہن ان سے منسوب تھیں، اردو، انگریزی اور سنسکرت کی کئی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، جن میں قرآن پاک کی انگریزی تفسیر ان کا شاہکار ہے، ۵ راگست ۱۹۳۶ء کو لسوان ہی کے ایک تالاب سے ان کی لاش نکالی گئی، فلسفیانہ استغراق میں نجانے کس طرح ٹہلتے ہوئے تالاب میں چلے گئے، کافی دیر کے بعد لاش برآمد ہوئی۔

علامہ کا کتب خانہ ابوالفضل شیخ بادشاہ حسین کی اچانک موت کے بعد ویران ہوگیا، بہت دنوں تک کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا، بہت سی کتابیں کیڑے چاٹ گئے، آخر میں جو بچ گئیں اس کا کچھ حصہ محمود آباد کی لائبریری سقراط اور باقی کتابیں شمس العلما مولوی ناصر حسین کے کتب خانہ ناصریہ (کھجوہ لکھنؤ) میں منتقل کردی گئیں،

علامہ کے خاندانی کتب خانے کا شمار کسی زمانے میں لکھنؤ کے مشہور کتب خانوں میں تھا، خاندانی ذخیرۂ کتب کے علاوہ اچھے صاحب عیش کے عہد میں بہت سی کتابیں اس کتب خانے میں جمع ہوگئی تھیں، لیکن ۱۹۰۵ء میں اس کتب خانے کا بڑا حصہ آتش زدگی سے تباہ ہوگیا، جو کچھ بچ گیا وہ بعد میں علامہ اپنے ہمراہ لسوان لے آئے تھے،

اسی کتب خانے کی ایک نامکمل اور مختصر سی فہرست مجھے دستیاب ہوئی ہے، جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست ان فہرستوں میں سے کوئی ایک نامکمل فہرست ہے جو (غالباً) ابوالفضل شیخ بادشاہ حسین کی وفات کے بعد مرتب کی جارہی تھیں، اس مختصر فہرست میں انگریزی اردو، فارسی اور عربی کی تخمیناً ایک ہزار کتابوں کا ذکر ہے، سنسکرت اور ہندی زبان کی کوئی کتاب اس فہرست میں نہیں ہے، جن قلمی کتابوں کی تفصیل اس میں دی گئی ہے، انکی تعداد صرف ستر ہے، جو اصل مخطوطات سے یقیناً بہت ہی کم ہے، اس لیے کہ جہاں تک میرے علم میں ہے، اس لائبریری کے مخطوطات ایک ہزار سے کہیں زائد تھے،

اسی نامکمل اور مختصر فہرست کا صرف وہ حصہ اس مضمون میں پیش کیا جارہا ہے جو صرف عربی اور فارسی مخطوطات پر مشتمل ہے، میں نے اس فہرست کو بغیر کسی ترمیم کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، صرف بعض بعض مقامات پر مکررات کو دور کرنے کے لیے معمولی رد و بدل ضرور کرنا پڑا ہے، اس فہرست کی علمی افادیت کیا ہے؟ اس کا فیصلہ تو ارباب علم ہی کر سکیں گے۔ لیکن اس سے بعض ایسے نادر مخطوطات کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے، جو عام دسترس سے باہر ہیں،

مخطوطہ	کیفیت
۱- بحار الانوار مجلد کتاب السماء والعالم نصف آخر (۱۲۰۱ھ)	نہایت خوشخط۔ ناقص الاول، سنہ کتابت تحریر نہیں ہے علامہ غفران مآب سید دلدار علی کی مہر ۱۲۰۱ ہجری العنو ثبت ہے،
۲- ایضاً ،،	
۳- کتاب السماء والعالم المجلد الرابع من بحار الانوار المجلسی ترجمہ محمد رضی بن محمد	
۴- احوال خود نوشت سلطان طہماسپ ابن اسمٰعیل بن حیدر الصفوی الحسینی (مکتوبہ ۱۲۱۲ھ)	ابوالفتح سلطان محمد مرزا الصفوی کے حکم سے ۱۲۱۲ھ میں مرزا اغلام علی نے ولی عہد بہادر ابوالمظفر محمد اکبر شاہ کے لیے اس نسخہ کی کتابت کی ہے، کتاب نایاب ہے،

۵ تا ۷۔ (مجموعۂ کتب) ۱- اعراب القاری
علی اول باب صحیح البخاری
۲- کشف الخدر عن امر الخضر
۳- المعرفۃ بالمرتبۃ الشہودیہ فی المنزلۃ
الوجودیہ
۴- تحقیق الاحتساب فی تدقیق الانساب
۵- النافعۃ للمناسک فی فضیلۃ الانساک
کلہم من مصنفات علی بن سلطان
محمد الہروی القاری (۱۲۹۴ھ)

یہ پانچوں رسائل مولانا ابو الغنا محمد عبد المجید
ابن ابو الحیا، محمد عبد العلیم اللکھنوی الفرنگی محلی
کے تحریر کیے ہوئے ہیں، کتابوں پر مولانا کی مہر
(۱۲۹۴ھ) ثبت ہے

۸- بدائع وقائع۔ مصنفہ رائے رایان
آنند رائے۔ (مکتوبہ ۱۲۰۳ھ)

مصنف نے اپنے محمد شاہ کے حالات سنہ ۲۱ جلوس قبل ورود
نادر شاہ تک لکھے ہیں، سنہ کتابت ۱۲۰۳ھ ہے، نایاب نادر نسخہ ہے،

۹- کتاب الشفا حکیم بو علی سینا

ناقص، نہایت خوشخط، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا

۱۰- کشکول قلمی (مکتوبہ ۱۰۷۴ھ)

مختلف خطوط شاہ طہماسپ و شاہ عباس و شہنشاہ
اکبر وغیرہم۔ اور مختلف غزلیات اساتذۂ فارسی
ادعیہ و تعویذات، نسخہ جات وغیرہ کا مجموعہ ہے، مختلف تحریرات

۱۱- بیان واقع (مکتوبہ ۱۱۹۳ھ)

وقائع و احوالات نادر شاہ مصنفہ حاجی
عبد الکریم خاں یکے از مقربان محمد شاہ
یہ کتاب نایاب ہے، مصنف نے اس میں چشم دید حالات
از ابتدائے خروج و عروج نادر شاہ و حملہ ہندوستان

تا مقتول شدن نادر شاہ ہیں۔ اور اس کے بعد
احمد شاہ بن محمد شاہ رنگیلے کے حالات پر منتہی ہے،
مصنف نادر شاہ کے حملے کے وقت خود دلی میں
موجود تھا اور جب نادر شاہ ایران واپس ہوا تو
حسب ایما محمد شاہ یہ بھی حکیم علوی خاں (نواب
معتمد الملک سید علوی خاں سید ہاشم) کے ساتھ
ایران گیا اور وہاں سے حج بیت اللہ اور زیارات
عتبات عالیات سے بھی مشرف ہوا، یہ لوگ توران،
خراسان، ماژندران کی لڑائیوں میں بھی نادر شاہ
کے ساتھ تھے، قزوین سے بمشکل پیچھا چھڑا کے حج
کے لیے روانہ ہو سکے تھے، اس کتاب میں نادر شاہ
کے حالات کے علاوہ حج و زیارت کے سفرنامے، دیار
و امصار کے واقعات و عجائبات کا دلچسپ تذکرہ
بھی کیا گیا ہے، مصنف مذہب سنت والجماعت
سے تعلق رکھتا تھا، یہ نسخہ مصنف کے اصل نسخہ کی
نقل ہے، خاتمۂ کتاب پر یہ عبارت درج ہے:
"تمام شد احوال نادر شاہ بتاریخ بست و نہم شہر
ذی الحجہ سنہ ۲۱ جلوس شاہ عالم بادشاہ مطابق سنہ ۱۱۹۳ھ
بروز جمعہ از دست حقیر فقیر عاصی بالتقصیر ٹیک چند کاتب

پانی پتی بخاطر داشت منشی صاحبان ارجن سنگھ جی وبہادر سنگھ جی منشیان خالصہ شریف"۔

۱۲- المتوسطات

علم ہندسہ و اقلیدس میں ہے، سنہ کتابت نہ معلوم ہو سکا،

۱۳- کتاب مکارم الاخلاق الشیخ ابی علی الطبرسی

کتاب مکمل ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے،

۱۴- دستور العمل ہندوستان یعنی مجمع التواریخ (سنہ تالیف ۱۱۱۵ھ)

کل ہندوستان کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، ابتدائے کلجگ سے لیکر ظہور اسلام تک نیز امیر تیمور صاحب قران سے لیکر فرخ سیر تک کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، مولف دربار عالمگیری سے وابستہ معلوم ہوتا ہے، اس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے، سنہ تالیف ۵ سنہ جلوس عالمگیری مطابق سمبت سنہ ۱۷۶۴ بکرمی موافق سنہ ۱۱۱۵ھ ہے، اور کتابت بھی اسی زمانہ کی معلوم ہوتی ہے، کاتب کا نام نہیں ہے کیونکہ آخری چند صفحات غائب ہیں، کتاب نایاب ہے،

۱۵- تاریخ نزہۃ القلوب حمد اللہ بن ابی بکر ابن حمد اللہ المستوفی القزوینی

مشہور کتاب ہے، کاتب محمد تقی نے نواب امین الدولہ محسن الملک شاہنواز خان مستقیم جنگ کے حکم سے کتابت کی ہے، سنہ کتابت بھی لکھا ہے، (افسوس کہ فہرست میں سنہ کتابت نہیں ہے)

۱۶- مجموعہ قصاید وقطعات ورباعیات عرفی شیرازی (اور) مجموعۂ اشعار فارسی از کلام اساتذۂ شعرائے ایران (مکتوبہ سنہ ۱۲۳۳ھ)

ناقص الاول - کاتب بہاری لال نے ماہ رمضان ۱۲۳۳ھ میں لکھی ہے۔

۱۷- معیار العجم در فن عروض شعر

سنہ کتابت نہیں ہے،

۱۸- شرح مختصر الاصول (سنہ ۱۲۰۱ھ)

ناقص الاول والآخر، سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا، غفرانمآب علامہ سید دلدار علی کی مہر سنہ ۱۲۰۱ھ ثبت ہے۔

۱۹- ۱- (مجموعہ) احادیث النبیؐ

۲- رسالہ غوث الاعظم

۳- مکتوبات محبوب سبحانی (حضرت شیخ عبد القادر جیلانی)

تینوں کتابیں ایک جلد میں شامل ہیں۔ سنہ کتابت نہیں ہے،

۲۰- کتاب الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ الدینوری

سنہ کتابت نہیں ہے، سرورق پر مہر سلطان العلماء سید محمد لکھنوی سنہ ۱۲۳۹ھ ثبت ہے۔

۲۱- مناقب مرتضوی

صفحات ۴-۵-۶-۷، اور صفحہ آخر غائب ہے

۲۲- مرات المخلوقات[1] (سنہ تصنیف سنہ ۱۰۴۱ھ)

مصنف شیخ عبد الرحمن چشتی امیٹھی مولفہ سنہ ۱۰۴۱ھ عہد شاہجہاں، کاتب مصباح الدین ولد محمد ناظم دتھاولی بموجب فرمایش منصور علی خاں برادر شیر دین خاں عامل پرگنہ مذکور۔ ۱۵ جمادی الثانی سنہ ۲۲ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۹۴ھ

[1] مرات المخلوقات کا اصل نسخہ اب بھی شاہ عبد الرحمن چشتی کے خاندان میں محفوظ ہے، میں نے شاہ صاحب کے پوتے محبی سید الظفر سب انسپکٹر پولیس کے پاس اسے دیکھا ہے، شاہ عبد الرحمن چشتی کا مزار دریائے گومتی کے کنارے موضع تیرگاؤں ضلع بارہ بنکی میں مرجع خاص و عام ہے، تخمیناً پچاس سال ہوئے جب مرأت المخلوقات کا اردو ترجمہ شاہ عبد الرحمن کے پوتے نے کیا تھا، غالباً رائے بریلی کے کسی پریس نے اسے چھاپا تھا، اب کمیاب ہے، میں نے یہ اردو ترجمہ بھی دیکھا تھا، مترجم اور پریس کا نام اس وقت حافظے سے محو ہو گیا۔

۲۳- کتاب در ذکر بعضے انواع حیوان و احکام خواص آن (مکتوبہ ۱۲۵۴ھ)

مصنفہ شیخ علی حزیں، ناقص الآخر، ۱۲۵۴ھ میں محمد حفیظ اللہ نے کتابت کی،

۲۴- کتاب النجاۃ للشیخ الرئیس ابو علی سینا

کاتب کا نام اور سنہ کتابت نہیں ہے، آخر میں صرف اتنا لکھا ہے "قد تم علی ید الفلسفی الہندی" معلوم نہیں یہ فلسفی ہندی کون بزرگ ہیں ؟

۲۵- حلیۃ المتقین

ناقص الاول

۲۶- تفسیر بزبان فارسی مکتوبہ ۱۱۳۵ھ

ناقص، اصل نام معلوم نہ ہوسکا، غالباً تفسیر حسینی ہے، آخر میں تحریر ہے "پنجشنبہ چہارم شہر جمادی الاول ۱۱۳۵ھ دار الخلافہ شاہجہان آباد۔"

۲۷- کتاب من لا یحضرہ الفقیہ ابن بابویہ القمی (مکتوبہ ۱۲۳۱ھ)

(دوسری جلد) ناقص الاول، کاتب علی صغیر ہمدانی بن علی وردی ابن کلب علی، یکشنبہ ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ

۲۸- تلخیص المقال فی اسماء الرجال (مکتوبہ ۱۰۶۳ھ)

کاتب محمد حسین بن احمد منصور النجفی، سنہ کتابت ۱۷ جمادی الاول ۱۰۶۳ھ

۲۹- قصۃ الحسینؑ بن علی رضی اللہ عنہما وسبب خروج من مکۃ الی العراق

منقول از تاریخ ابن کثیر شامی، کتابت حال ہی کی ہے تاریخ ابن کثیر سے امام حسینؑ کے حالات کو نقل کیا گیا ہے

۳۰- کتاب در ادعیۂ اعمال و اوراد عربی (۱۲۲۹ھ)

نامعلوم الاسم، اول و آخر ناقص، اسکے مصنف الشیخ ابراہیم الکفعمی صاحب المصباح معلوم ہوتے ہیں، اکثر صفحات پر محمد جعفر الحسینی کی مہر ۱۱۲۹ھ ثبت ہے

۳۱- ذخائر العقبی فی المودۃ اہل القربی لمحب الدین الطبری

اول و آخر ناقص، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا،

۳۲- منابر در مواعظ ماہ رمضان المبارک عربی

کاتب و سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا،

۳۳- دیوان ظہوری

کرم خوردہ مکتوبہ ۱۱۴۱ھ

۳۴- شرح تجرید الکلام

اول و آخر ناقص، کاتب سنہ کتابت کا کچھ پتہ نہیں چلتا،

۳۵- الملل والنحل علامہ شہرستانی (مکتوبہ ۱۲۶۳ھ)

سنہ کتابت ۱۲۶۳ھ، معروف و مشہور کتاب ہے،

۳۶- ہدایۃ الحکمۃ

کتابت ۱۲۶۵ھ

۳۷- مرأت البلاد (فارسی) (سنہ تصنیف ۱۲۳۵ھ)

مولفہ سید ہاشم علی الرضوی الکھنوی جو کہ غفرانمآب علامہ سید دلدار علی کے معاصرین میں تھے، انکا سنہ ولادت ۱۱۷۷ھ ہے، سنہ کتابت معلوم نہیں ہوسکا، مگر یہ نسخہ مصنف ہی کے زمانے کا مکتوبہ ہے، ممکن ہو اصل نسخہ ہو، سرورق پر سلطان العلماء کی مہر ۱۲۶۰ھ ثبت ہے، مصنف سید ہاشم علی نے بوقت تصنیف ۱۲۳۵ھ میں اپنی عمر پچاسی سال بتائی ہے۔

۳۸- شرح مواقف دو جلدیں (سنہ تصنیف ۸۰۶ھ)

سیف الدین بن مولانا الشیخ البخاری اس کے کاتب ہیں، جنھوں نے شہر بخارا میں اسکی کتابت کی، ۸۰۶ھ میں جب شہر سمرقند میں اسکی تصنیف کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اس کے بعد ہی کا یہ مخطوطہ ہے، اس لیے باعتبار کتابت نہایت قدیم مخطوطہ ہے، اس کتاب پر "عزیز اللہ" کی مہر ہے، اور مہر کا سنہ ۱۱۲۲ھ ہے۔

۳۹- سوانح مولوی عبدالقادر — صاحب سوانح خود ہی اس کے کاتب اور مصنف ہیں، یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ہم عصر تھے، سنہ کتابت درج نہیں ہے،

۴۰- مصطلحات الشعراء — ناقص الآخر، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا،

۴۱- فوائح — مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ سنہ کتابت کا غالباً یہ "فوائح میبذی" ہے،

۴۲- تذکرۃ الموضوعات، شیخ محمد طاہر گجراتی (مکتوبہ سنہ ۱۰۲۲ھ) — اصل نام "الموضوعات فی الاحادیث المرفوعات" ہے سنہ کتابت سنہ ۱۰۲۲ھ ہے

۴۳- کامل شیخ بہائی علیہ الرحمہ — قدیم ترین نسخہ عہد شاہجہانی کا ہے، خاتمہ کتاب کی عبارت درج ذیل ہے،

"تمام شد کتاب مسمی بہ کامل بہائی روز ہفتہ ہم ماہ محرم الحرام سنہ سی وچہار در دار السرور برہان پور در حین کہ لشکر... معلان ابتلا یافتہ بود وجود شہزادہ خرم و مہابت خاں از برابر یک دیگر نشستہ بودند و نہایت پریشانی خاطر داشت در منزل جناب شوکت وعظمت جناب..... ثانی سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ وانا العبد الحقیر المحتاج عفو ربہ الباری محمد زمان الحسینی السبزواری رب اغفر......!"

۴۴- اصول کافی — ناکمل وکرم خوردہ

۴۵- کتاب البستان الفقیہ الزاہد ابو اللیث نصیر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی — سنہ کتابت نہیں ہے،

۴۶- شرح قصائد السبع المعلقات (مکتوبہ ۱۲۲۲ھ) — غیر مکمل، سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ

۴۷- درۃ الغواص لاذہان الخواص — ناکمل سنہ کتابت معلوم نہ ہوسکا،

۴۸- سورۂ یٰسین ودعائے کمیل — کاتب شمس الدین عرف نواب بہادر، سنہ کتابت ۱۲۹۵ھ

۴۹- رسالہ در ظہور مزار شریف حضرت علیؓ در جوار بلخ — سلطان حسین بادشاہ ہرات کے عہد کا ایک مختصر رسالہ تقریباً سنہ ۹۰۰ھ کا مکتوبہ ہے،

۵۰- دیوان ابو الطیب المتنبی الشاعر — مکتوبہ سنہ ۱۰۹۴ھ (یوم جمعہ، شہر ربیع الاول) کاتب عبداللہ علاج محمد خاں

۵۱- دیوان ابی العلاء المعری المسمی بسقط الزند — سنہ کتابت کا پتہ نہیں چل سکا

۵۲- زوال الشرح فی شرح منظومہ ابن فرح الاشبیلی — سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا

(نوٹ) کتب نمبر ۵۰ لغایۃ ۵۲ پر مہر "قائم آل محمد مہدی" ثبت ہے۔

۵۳- تاریخ اخبار الاخیار — ہندوستان کے تمام سلاطین وفقراء ہنود و اسلام کے ذکر پر مشتمل ہے، مصنف کا نام اور سنہ کتابت معلوم نہ ہوسکا، یہ کتاب محدث دہلوی شیخ عبدالحق کی کتاب "اخبار الاخیار" نہیں ہے بلکہ دوسری ہے

۵۴- کتاب در علم طب — مصنف "طب اکبر" کی ایک تصنیف ہے، اول وآخر ناقص، سنہ کتابت اور کاتب کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا،

۵۵- تذکرۃ الائمہ ملا باقر مجلسی — پہلا صفحہ غائب ہے اور آخر کے چند صفحات بھی، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا،

۵۶- تفسیر خلاصۃ المنہج — ناتمام وناکمل

۵۷- تفسیر عربی — ناقص الاول، ودیگر تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔

۵۸- کتاب در تصوف وسلوک عربی — ناقص الاول وآخر، سنہ کتابت معلوم نہ ہوسکا۔

۵۹- کتاب در ادعیہ و اعمال و وظائف و اذکار و زیارات — نامعلوم الاسم، ناقص الاول

۶۰- تاریخ نامعلوم الاسم ضخیم (فارسی) — ایک قدیم مخطوطہ حضرت آدم سے لیکر مصنف نے اپنے عہد تک کے حالات و واقعات تحریر کیے ہیں،

۶۱- کتاب عربی (نامعلوم الاسم) — اول و آخر ناقص

۶۲- کتاب علم بیان (فارسی) — نامعلوم الاسم۔ اول و آخر ناقص

۶۳- کتاب در مطاعن صوفیہ — اول و آخر ناقص، نامعلوم الاسم

۶۴- مثنوی حکیم سنائی
۶۵- مثنوی نان و حلوا علامہ بہائی
۶۶- مثنوی شاہ و درویش مولانا ہلالی
۶۷- مثنوی گلشن آرا،
۶۸- مثنوی ارشاد السالکین
۶۹- انتخاب مثنوی مولوی روم منتخبہ مولانا جامی مکتوبہ ۱۰۹۹ھ

(۶۴ تا ۶۹) یہ چھ کتابیں ایک شیرازہ میں منسلک ہیں، الکاتب کا نام "محمد غیور" اور سنہ کتابت ۲۱ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۹۸ھ

۷۰- تاریخ گلستاں (مکمل) — مصنف محمد مستجاب خاں بن حافظ رحمت اللہ خاں سنہ کتابت نہیں ہے، حافظ رحمت خاں کے عہد کے واقعات و حالات پر مشتمل ہے،

محبت خاں محبت

اور

ان کا کلام

از

جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب

(۲)

مثنوی "اسرار محبت" محبت خاں محبت کی مشہور تصنیف ہے، اسی کے ذریعہ تاریخ اردو ادب میں محبت کا تعارف ہوا ہے، اس وقت اسرار محبت کے تین قلمی نسخے محفوظ ہیں، ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے، دوسرا نسخہ سرسالار جنگ حیدرآباد کے کتب خانے میں اور تیسرا انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرۂ کتب میں، حسرت موہانی نے اس مثنوی کو مثنوی سراپا سوز اور مثنوی طلعت الشمس کے ساتھ طبع کرایا ہے، یہ مثنوی محبت کے دیوان کی طرح غیر معروف نہیں ہے بعض اہل قلم اس کا تعارف کرا چکے ہیں،

اس وقت میرے پیش نظر مثنوی اسرار محبت کا نسخہ رامپور ہے، یہ مخطوطہ دریائے عشق، بکٹ کہانی، مثنوی لطف، مثنوی اوز، قصہ سوداگر بچہ اور بادہ نامہ کے ساتھ مجلد ہے۔ اس پوری جلد کا نام اسرار محبت کا رکھدیا گیا ہے، شاید اس لیے ایسا کیا گیا کہ اس مجلد کے سلسلہ مثنویات میں پہلی مثنوی اسرار محبت ہے، کتاب پر ایک مختصر تحریر ہے جس کے مطابق

ان مثنویات کو جمع کرنے کی غرض یہ تھی کہ عشقیہ اشعار جمع کیے جائیں، کتاب پر نہ تمہید ہے نہ ترقیمہ، اس لیے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسرار محبت کو کب اور کس نے نقل کیا، کاتب کی لاپرواہی کا ثبوت ہر صفحے پر موجود ہے۔ کتابت نہایت بدنما اور بے زیب ہے، ایسی تحریر کو کتابت کہنا ذوق سلیم پر بار ہے کاتب نے ضمنی عنوانات کے لیے بقدر دو سطر کے جگہ چھوڑ دی تھی مگر عنوانات نہیں لکھے لیکن مخطوطہ اچھی حالت میں ہے،

مثنوی میں کل پانچسو اکیانوے (۵۹۱) اشعار پچیس (۲۵) صفحات پر مشتمل ہے، مثنوی کا سنہ تصنیف مندرجہ ذیل مصرعۂ تاریخ کے مطابق ۱۱۹۷ھ مطابق ۸۳-۱۷۸۲ء ہے۔

توقع ہے جو کوئی اہلِ نظر ہو محبت سے کرے اس پر نظر دو

کہی تاریخ اس کی یہ بصنعت عجب قصہ ہے اسرار محبت
۱۱۹۷ھ

اس اعتبار سے یہ مثنوی، سحر البیان سے دو سال قبل تصنیف ہوئی،

مثنوی محبت میں سسی پنون کا مشہور قصۂ عشق نظم کیا گیا ہے، اصل قصہ نثر میں تھا، مسٹر جانسن (ممتاز الدولہ) کی فرمائش پر محبت نے اسے نظم کا جامہ پہنایا، مندرجہ ذیل اشعار میں جانسن سے تعلقات اور اسرار محبت کی وجہ تصنیف کا ذکر کرتے ہیں ؎

کہ فرمایش ہے یہ اک نکتہ داں کی شفیق و مہربان و قدرداں کی

وہ مثل جان و عالم جملہ تن ہے تبھی نام اس کا مسٹر جانسن ہے

کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات اگر عنائع نہ ہووے اس میں اوقات

تو مضموں کرکے اس قصے کا معلوم یہ ہے منثور کر تو اس کو منظوم

یہ بات اتنے لیے تجھ سے کہی ہے کہ مشق اس کی بہت تجھکو رہی ہے

سو اس کی رغبت دل کرکے معلوم کیا میں نے اس افسانے کو منظوم

مثنوی کا آغاز محبت کی تعریف سے ہوتا ہے ؎

محبت نام اور ہر دل نگیں ہے محبت سے کوئی خالی نہیں ہے

جو سمجھو ذات مطلق فی الحقیقت محبت ہے محبت ہے محبت

محبت بوئے گل رگل ہے محبت محبت جز و کل اور کل ہے محبت

محبت باطن اور ظاہر محبت محبت اول اور آخر محبت

محبت چشم کو دے اشکباری محبت دل کو سونپے بیقراری

اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں نو اشعار ہیں ؎

محمد مصطفےٰ رنگِ گلِ عشق دو زلف ان کی بہارِ سنبلِ عشق

پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت ہے ؎

اسے ہے عشق جو نفس نبی ہے اسے ہے عشق جو مولا علی ہے

اس کے بعد اصل قصے کی طرف گریز ہے۔

بیاں کرتا ہوں اب اسرارِ عشق آہ عجائب رنگ کے ہیں کارِ عشق آہ

محبت نے بہت بیجاں کیے ہیں کہوں کیا جو جو کارستاں کیے ہیں

انھیں میں سے یہ ایک افسانۂ عشق بیاں کرتا ہوں میں دیوانۂ عشق

مثنوی کے قصے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیونکہ مصنف نے اس مشہور خاص و عام قصے کو دلچسپ انداز میں پیش نہیں کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی نثری قصہ تھا، مگر انھوں نے اس پر مثنوی کی بنیاد رکھدی، اس طرح ان کا قلم مقید ہو گیا، اور وہ اس میں گل نہیں کھلا سکے، اس کے علاوہ ایک بات اور بھی قیاس میں آتی ہے، مصنف کا مقصد محبت کے اسرار بیان کرنا تھا، اس کے لیے انھوں نے سسی پنوں کا قصے کا

انتخاب کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مثنوی منظر نگاری، عصری رسوم و طرز معاشرت اور ضمنی دلچسپ جزئیات سے خالی ہے، اور مثنوی میر حسن کی خصوصیات اس میں نہیں ہیں۔

اس مثنوی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) سسی کا سراپا (۲) پنوں کا سراپا، (۳) واردات عشق

سراپا ۹۰ اشعار میں ہے، مصنف نے اس میں پورا زور قلم صرف کیا ہے، اور واسوخت کے انداز میں اشعار لکھے ہیں، پنوں کا سراپا مختصر مگر پر اثر ہے، تیسرا حصہ جسے واردات عشق سے موسوم کیا گیا ہے، مثنوی کی معراج فن ہے، اس میں وصل و فراق کا بیان، اسرار عشق کا اظہار، سسی کے جذبات کی مصوری وغیرہ ہیں جو اس کو اعلیٰ پایہ کی مثنویات کی صف میں لے آتی ہیں، مثنوی کے ان تینوں حصوں کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری سحر بیانی کی طرح ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے، البتہ میر حسن کی زبان زیادہ بامحاورہ اور ٹکسالی ہے۔ اور اس زمانہ کی زبان کے لحاظ سے مثنوی اسرار محبت کم رتبہ نہیں ہے، اردو مثنوی کے ارتقا میں دونوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اب اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں سسی کا سراپا:

سراپا کیا لکھوں اس شعلہ رو کا
کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا

عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود

پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر
رگِ ابر سیہ جیسے ہو مہ پر

ڈوپٹا چاند تارے کا زری بات
جو اوڑھے تھی کہ اپنی بیٹیاں تھات

سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر
شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر

گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے
کہ جوں مار سیہ لہریں دکھاوے

بہت سے تھا دلوں کا اس میں مسکن
اچنبھا ہے کہ اک سانپ اور کئی من

دو کیفی انکھڑیاں تھیں صورتِ جام
ولیکن ان سے کیا ہو نسبتِ جام

نگہ بد بر فلک کی اس جبیں پر
کہ اک ابر سیہ جیسے ہو مہ پر

وہ بینی اس مہ وجو نے پائی
کہ جن سے ان کو خود بینی سکھائی

وہ دنداں آبدار اس سیمبر کے
کہ سوراخ ان سے ہیں دل میں گہر کے

کروں کیا خوبی لب کی میں تقریر
قیامت اس پہ تھی مسّی کی تحریر

تبسم میں نظر اس رنگ وہ آئے
کہ غنچہ جیسے نافرہان کا کھل جائے

زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر
سخن ہو جائے گم میری زباں پر

کوئے کیا کیا جھکاوے عشق اس آہ
جسے چاہ زنخ کی اس کے ہو چاہ

نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی
وہ ہے گویا صراحی دار موتی

حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ
کہ جوں خوشخط لکھیں سرخی سے بسم اللہ

جو وصف اس ساق سیمیں کا سنے ہے
بحسرت شمع رو رو سر دھنے ہے

قد موزوں وہ اپنا جب دکھا جائے
اور اس کو خندق پا تک نظر آئے

تو حیرت سے ہوں یہ سب کو یہ لکھے
بن شمشاد میں غنچے نہ دیکھے

جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت
کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت

جو ہو ٹک فرش گل پہ گرم رفتار
رگ گل پشت پا سے ہو نمودار

نہ سج دھج اس کی ہو مانی سے تحریر
وہ گویا حسن کی تھی ایک تصویر

پنوں کا سراپا:

یہ سج دھج اور یہ محبوب صورت
کہ تھا ایسا نہ کوئی خوبصورت

وہ زلف و چشم و ابرو، قد و قامت
بلائے فتنہ و آفت قیامت

سسی کے فراق میں پنوں میں حالت ؎

کبھی تو بسترِ غم پر بلکنا ۔۔۔ کبھی بالیں پہ سر دے دے پٹکنا
کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا ۔۔۔ کبھی کچھ ذکر دل ہی دل میں کرنا
غرض دشوار تھا آرام پانا ۔۔۔ کبھی اٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا ۔۔۔ کبھی اٹھنا تو پھر غش کھا کے گرنا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا ۔۔۔ کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا

ایک موقع پر سسی دل ہی دل میں منصوبے باندھ رہی ہے کہ وہ پنوں سے بوقت ملاقات کیا کہے گی۔

یہ کہتی تھی کہ اب جا کر ملوں گی ۔۔۔ کل ہی دیکھو تو کیا کیا کچھ کرونگی
کہوں گی میں نہ کچھ غم ضبط کر کے ۔۔۔ نہ بولوں گی کوئی دم ضبط کر کے
تو پھر پنوں کے وہ کھاوے گا قسمیں ۔۔۔ کہے گا میں بھی تھا گویا قفس میں
ندامت ہے نہایت اس کی مجھکو ۔۔۔ جو آیندہ ہوا ایسا تو قسم لو
یہ سن کے اس سے مل جاؤنگی پھر میں ۔۔۔ نہ شکوہ منہ پہ کچھ لاؤنگی پھر میں

اصل قصے کے مطابق سسی و پنوں کی موت ہو جاتی ہے اور وہ اس دنیا سے ناکام و نامراد جاتے ہیں۔ محبت نے یہ دردناک منظر صرف دو اشعار میں پیش کیا ہے ؎

نہ دونوں نے کہی آپس میں کچھ بات ۔۔۔ رہی بس حشر پر موقوف ملاقات
گئے حسرت بھرے دونوں جہاں سے ۔۔۔ نہ کیونکر غم ہو ان کی داستاں سے

اس اختصار میں زندگی کے کتنے افسانے پوشیدہ ہیں،

محبت خاں محبت کی وفات لکھنؤ میں ہوئی اور متصل وزیر باغ کشور گنج میں دفن ہوئے، سنہ وفات میں اختلاف ہے، تذکرہ نگاروں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ان کی وفات ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء میں ہوئی، ہمارے خیال میں محبت خاں محبت کی تاریخ وفات ۱۳؍ صفر ۱۲۲۴ھ مطابق ۳۰؍ مارچ ۱۸۰۹ء زیادہ صحیح ہے جو الطاف علی صاحب نے حیات حافظ رحمت خاں میں درج کی ہے۔

قاضی مبارک اور انکی شرح سلم

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے استاد شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

"قاضی مبارک اور ان کی شرح سلم" کے عنوان سے مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی کا ایک مضمون شائع شدہ معارف مارچ ۱۹۶۴ء نظر سے گزرا، اسے پڑھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی، تعجب اس لیے کہ اس "عہد تنویر" میں بھی جبکہ قدیم معقولات کو "نامعقولیت" کے اور منطق کو "کج بحثی" کے مترادف سمجھا جاتا ہے، اس متاعِ کاسد کے خریدار باقی ہیں اور مسرت اس لیے کہ

بہر نرخ کہ می گیرند کالائے وفا خوب است — پس از مدت گزار افتاد بر ما کاروانے را

اس زمانے میں جبکہ ہم اپنے گذشتہ ثقافتی کمالات سے نامانوس ہوتے جارہے ہیں، اس قسم کے مضامین کی اشاعت انتہائی مفید ہوگی، ع

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اس عاجز کا خیال ہے کہ ہماری قدیم معقولات محض "نامعقول" نہیں تھی، بلکہ عقل و دانش کا عنصر بھی اس میں موجود تھا، اور غالباً بڑی وافر مقدار میں، اسی نے ہمارے "دو علامی" [علامی ابوالفضل اور علامی سعد اللہ خاں] نیز علامی افضل خاں پیدا کیے، جن کے حسن تدبیر نے ملک کی عظمت و شوکت میں چار چاند لگا دیے تھے، وہی اس کی مزعومہ کمزوریاں جن کا پچھلی صدی سے مذاق اڑایا جا رہا ہے، تو ہر شے میں افراط و توغل بجائے خود فساد کا باعث بن جاتے ہیں، دور کیوں جایئے، جدید سائنس ہی کو لے لیجیے، جس پر عہد حاضر کی عظمت کا دارومدار

ہے، اور جس نے آج کے انسان کو "فوق الانسان" بنا دیا ہے، مگر افراط و توغل نے اس کی افادیت کو بھی مشکوک بنا دیا، حالانکہ سائنس کی افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا اس کی تضحیک کا تو سوال ہی کیا۔

مگر قدیم معقولات کے خلاف اس شدت سے پروپیگنڈا کیا گیا کہ آخر اس کا جڑ پتہ ہی کھود ڈالا، ایسے ہمت شکن حالات میں اس فن شریف کے علمبرداروں کا ذکر واذکار بسا غنیمت ہے۔

۲۔ جناب مفتی محمد رضا صاحب کا مضمون بڑا معلومات افزا ہے، البتہ قاضی مبارک کے سلسلۂ تلمذ کے بارے میں دو کلمے عرض کرتا ہوں،

مفتی صاحب نے قاضی مبارک کے تلمذ کے دو سلسلے بیان کئے ہیں،

ا۔ پہلے سلسلے کی رو سے ان کا شجرۂ تلمذ ملا قطب الدین شہید سہالویؒ تک پہنچتا ہے اور اس طرح وہ خاندان فرنگی محل میں منسلک ہو جاتے ہیں، قاضی مبارک شاگرد تھے ملا قطب الدین گوپامئوی کے، وہ شاگرد تھے اپنے پدر بزرگوار قاضی شہاب الدین گوپامئوی کے اور وہ شاگرد تھے ملا قطب الدین شہید سہالویؒ کے،

ب۔ دوسرے سلسلے کی رو سے ان کا شجرۂ تلمذ میر زاہد ہرویؒ تک پہونچتا ہے: قاضی مبارک شاگرد تھے ملا صالح کے، اور وہ شاگرد تھے میر زاہد کے، نیز قاضی مبارک شاگرد تھے، ملا قطب الدین گوپامئوی کے، جنھوں نے ملا صالح سے میر زاہد کی کتابوں کی سند اور اجازت لی تھی، اور ملا صالح شاگرد تھے میر زاہد کے۔

لیکن ان دو سلسلوں کے علاوہ ایک تیسرا سلسلہ بھی ہے، جس کی رو سے قاضی مبارک کا شجرۂ تلمذ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی تک پہنچتا ہے، مگر مفتی صاحب نے دانستہ یا نادانستہ

اسے بیان کرنے کی زحمت نہیں فرمائی، اس معروض کی جرأت اس لیے ہوئی کہ میر غلام علی آزاد کا تذکرہ "ماثر الکرام" مفتی صاحب کے پیش نظر تھا اور اس کا انھوں نے اپنے فاضلانہ مضمون میں حوالہ دیا ہے:

"سلّم اور مسلّم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری حسب تصریح میر غلام علی آزاد بلگرامی (ماثر الکرام)..... ملا نظام الدین فرنگی محلی کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی کے بھی شاگرد تھے۔"[1]

اور اسی ماثر الکرام میں ملا قطب الدین گوپامئوی کے حال میں مرقوم ہے:-

"مولوی قطب الدین گوپامئوی..... پدرش قاضی شہاب الدین از علماے اعلام وقت بود. کسب کمال از خدمت مولوی عبد الرحیم مراد آبادی تلمیذ مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی نمود، و در جمیع علوم سیما ہیئت و ہندسہ عدیم المثل بود. وفاتش در عشرہ ثالثہ بعد مائہ و الف واقع شد. مولوی قطب الدین شاگرد پدر بزرگوار، و در ہمہ علوم معقول و منقول سر آمد روزگار بود. و علم ارشاد در فنون ریاضی رایت مہارت بآسمان می افراخت و اہل مستفیدان را بہ اشعۂ کمال لبریز می ساخت. بست و پنجم رمضان ۱۱۹۰ھ ستین و مائۃ و الف در آغوش بہشت آرمید۔"[2]

یعنی قاضی مبارک شاگرد تھے مولوی قطب الدین گوپامئوی کے [یہ تلمذ متفق علیہ ہے] مولوی قطب الدین گوپامئوی شاگرد تھے، اپنے پدر بزرگوار قاضی شہاب الدین گوپامئوی کے، قاضی شہاب الدین شاگرد تھے مولوی عبد الرحیم مراد آبادی کے اور مولوی عبد الرحیم شاگرد تھے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کے۔

۳- ویسے ان تینوں سلسلوں میں کوئی منافات نہیں ہے، یہ اس عہد کا عام

[1] ملاحظہ ہو معارف مارچ ۹۴ء ص ۱۹۰ [2] ماثر الکرام ص ۳۰۰

دستور تھا کہ طالب علم

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم

کے قائل اور عامل تھے، مثلاً میر سید اسماعیل بلگرامی نے پہلے مفتی عبد السلام دیوی سے کسب فیض کیا، اور پھر علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی سے [اور یہ دونوں اپنے عہد کے فحول علما میں سے تھے][1]

ملا فاضل بدخشی نے جو ملا صادق حلوائی کے شاگرد تھے، توران جاکر پہلے مرزا جان شیرازی اور پھر انکے شاگرد رشید ملا یوسف کوسج سے پڑھا، اور پھر ہندوستان آکر ملا جمال لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا،[2] اسی طرح میر فتح اللہ شیرازی نے [جنھوں نے ہندوستان میں علماے ولایت کی کتب معقولات کو رواج دیا] پہلے خواجہ جمال الدین محمود سے پڑھا (جو محقق دوانی کے شاگرد تھے) پھر امیر غیاث الدین منصور سے (جو محقق دوانی کے حریف امیر صدر الدین شیرازی کے شاگرد اور صاحبزادے تھے۔[3]

البتہ تذکرہ نگاروں نے تصریح نہیں کی کہ ان حضرات نے فاتحۂ فراغ کس استاد کی خدمت میں پڑھا،

رہی یہ بات کہ ان تینوں سلسلوں میں کس سلسلے کا رنگ قاضی مبارک نے قبول کیا، اس کا تعین نہایت مشکل ہے، ویسے قرائن اس جانب مشیر ہیں کہ انھوں نے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کی تحقیقات انیقہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔

[1] ماثر الکرام ص ۲۳۳ [2] بادشاہ نامہ مجلد اول حصہ دوم ص ۳۴۰

[3] ماثر الکرام ص ۲۳۷ – ۲۳۶

اسے بیان کرنے کی زحمت نہیں فرمائی، اس معروض کی جرأت اس لیے ہوئی کہ میر غلام علی آزاد کا تذکرہ "مآثر الکرام" مفتی صاحب کے پیش نظر تھا اور اس کا انھوں نے اپنے فاضلانہ مضمون میں حوالہ دیا ہے:

"سلم اور مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری حسب تصریح میر غلام علی آزاد بلگرامی (مآثر الکرام)..... ملا نظام الدین فرنگی محلی کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی کے بھی شاگرد تھے"[1]

اور اسی مآثر الکرام میں ملا قطب الدین گوپامئوی کے حال میں مرقوم ہے:-

"مولوی قطب الدین گوپامئوی..... پدرش قاضی شہاب الدین از علمائے اعلام وقت بود. کسب کمال از خدمت مولوی عبد الرحیم مرادآبادی تلمیذ مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی نمود، و در جمیع علوم سیما ہیئت و ہندسہ عدیم المثل بود. وفاتش در عشرہ ثالثہ بعد مائۃ و الف واقع شد، مولوی قطب الدین شاگرد پدر بزرگوار، و در ہمہ علوم معقول و منقول سرآمد روزگار بود و بحکم ارشاد در فنون ریاضی رایت مہارت بآسمان می افراخت و اہل مستفیدان را بہ اشعۂ کمال لبریز می ساخت، بست و پنجم رمضان ۱۱۶۰ھ ستین و مائۃ و الف در آغوش بہشت آرمید۔"[2]

یعنی قاضی مبارک شاگرد تھے مولوی قطب الدین گوپامئوی کے [یہ تلمذ متفق علیہ ہے] مولوی قطب الدین گوپامئوی شاگرد تھے، اپنے پدر بزرگوار قاضی شہاب الدین گوپامئوی کے، قاضی شہاب الدین شاگرد تھے مولوی عبد الرحیم مرادآبادی کے اور مولوی عبد الرحیم شاگرد تھے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کے۔

۲- ویسے ان تینوں سلسلوں میں کوئی منافات نہیں ہے، یہ اس عہد کا عام

---

[1] ملاحظہ ہو معارف مارچ ۶۴ء ص ۱۹۰ [2] مآثر الکرام ص ۳۰۰

دستور تھا کہ طالب علم

تتبع زہر گوشۂ یافتم

کے قائل اور عامل تھے، مثلاً میر سید اسماعیل بلگرامی نے پہلے مفتی عبد السلام دیوی سے کسب فیض کیا، اور پھر علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی سے [اور یہ دونوں اپنے عہد کے فحول علما میں سے تھے][1]

ملا فاضل بدخشی نے جو ملا صادق حلوائی کے شاگرد تھے، توران جاکر پہلے مرزا جان شیرازی اور پھر انکے شاگرد رشید ملا یوسف کوسج سے پڑھا، اور پھر ہندوستان آکر ملا جمال لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا،[2] اسی طرح میر فتح اللہ شیرازی نے [جنھوں نے ہندوستان میں علماے ولایت کی کتب معقولات کو رواج دیا] پہلے خواجہ جمال الدین محمود سے پڑھا (جو محقق دوانی کے شاگرد تھے) پھر امیر غیاث الدین منصور سے (جو محقق دوانی کے حریف امیر صدر الدین شیرازی کے شاگرد اور صاحبزادے تھے)[3]

البتہ تذکرہ نگاروں نے تصریح نہیں کی کہ ان حضرات نے فاتحۂ فراغ کس استاد کی خدمت میں پڑھا،

رہی یہ بات کہ ان تینوں سلسلوں میں کس سلسلے کا رنگ قاضی مبارک نے قبول کیا، اس کا تعین بنایت مشکل ہے، ویسے قرائن اس جانب مشیر ہیں کہ انھوں نے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کی تحقیقات انیقہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۳۳ [2] بادشاہ نامہ مجلد اول حصہ دوم ص ۳۴۰

[3] مآثر الکرام ص ۲۳۷ - ۲۳۶

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

سیدنا المحترم زید لطفکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والانامہ باعث سرفرازی ہوا، جو کچھ جناب عالی نے مولوی محمد یوسف صاحب جالندھری پر مراحم فرمائے اور جو کچھ معروضات کی طرف التفات کو کام میں لایا گیا، ان کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی تشریف فرما ہوئے تھے، ان حضرات کی عنایتوں کا بھی شکر گذار ہوں۔

یظن الناس بی خیراً و انی لشر الناس ان لم یعف عنی

یہ نالائق اپنے بزرگوں اور عنایت فرماؤں کی خدمت میں بجز دعاگوئی اور کیا کرسکتا ہے۔ وعلی الدعاء یعول المسکین

لا خیل عندک تہدیہا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

اگر فلک نے کچھ بھی اطمینان دیا تو ان شاء اللہ کما ینبغی اصلاحات ظہور پذیر ہونگی، تاہم بہت سی باتوں میں اصلاحات ہو رہی ہیں، امیدوار ہوں کہ دعوات صالحہ اور

خدماتِ لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں گے۔

والسلام

ننگ اکابر۔ حسین احمد غفرلہٗ

دار العلوم دیوبند۔ ۱۷ محرم الحرام ۱۳۴۷ھ

از دیوبند

۲۲ رجب المرجب ۴۹ھ

محترم المقام زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی، والا نامہ صادر ہو کر باعث سرفرازی و عزت افزائی ہوا، یاد آوری کا شکریہ، جناب مولانا حمید الدین صاحب مغفورؒ کے وصال کی اطلاع سے افسوس ہوا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے، آمین۔ بہر حال صبر کی ضرورت ہے، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، مجھکو خود مولانا محمد عرفان صاحب سے بھی معلوم ہو چکا تھا جس سے مجھکو بھی ایک گونہ اطمینان ہو گیا ہے،

دعوات صالحہ و کار لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام مع الاحترام، واقفین و پرسان حال حضرات کی خدمت میں سلام مسنون کہہ دیجئے،

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

سیدنا المحترم زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج مبارک، عرصہ سے نعمت ملاقات سے محروم ہوں، اس وقت کتابی ملاقات کا ایک بہانہ مل گیا ہے، اس لیے حاضر ہوتا ہوں۔

گورکھپور کے نوجوان اور سچے جذبات والے طلبہ کا عریضہ منسلک ہے، اصرار یہ ہے کہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے متعلق ایک مفصل بیان لکھا جائے، میں دنیائے تاریخ اور تحریر و تقریر میں جس قدر لنگ اور عاجز ہوں، آپ کے سامنے بیان کی حاجت نہیں، پھر اس طرہ یہ ہے کہ انتہائی مصروفیت کی بنا پر بالکل ہی فراغت نہیں، غازی مصطفےٰ کمال پاشا ترکی میں جنگ عمومی سے پہلے کوئی امتیازی شان نہیں رکھتے تھے، جب تک جنگ رہی جب تک بھی یہ زوایا خمول ہی میں روپوش رہے، ان کی شہرت جنگ کے بعد ہوئی، اس لیے میں ان کی تاریخ قدیم سے بالکل ناواقف ہوں، اس جنگ کے بعد مجھکو ان دیار میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی، حجاز میں دو مرتبہ جانا ہوا، تو اولاً تو نہایت سرسری طور پر تھا، ثانیاً علائق منقطع ہو چکے تھے، اس لیے کوئی صورت مجھکو بجز ہندوستان کے اخبارات کے ذرائع کے حاصل نہیں ہوسکے ان اخبارات کے دیکھنے کی مجھکو نہ فرصت ملتی ہے، نہ اسفار اور مشاغل ان تک پہنچنے دیتے ہیں، بنا بریں مجھکو پختہ یقین ہے کہ اس مسئلہ میں بھی معلومات کا ذخیرہ جناب کے پاس میری معلومات سے ہزاروں درجہ زائد ہوگا۔

ان طلبہ کا حسن ظن یہ ہے کہ اگر میں آنجناب سے درخواست کروں گا تو درخواست ٹھکرائی نہ جائے گی (خدا کرے کہ یہ حسن ظن صحیح ہو، اور واقعیت کا جامہ رکھتا ہو) بناءً علیہ میں ان کی خواہش کو پیش کرتا ہوا پر زور سفارش کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازا جائے گا۔

متحدہ قومیت کے متعلق اسی زمانہ میں کچھ قلمبند کیا تھا اور کچھ بعد میں مگر طباعت کی مشکلات وغیرہ سے بہت دیر میں تیار ہو کر شائع ہو سکا، ملاحظہ کے لیے ارسال کرتا ہوں، اگر بوقت فرصت ملاحظہ فرما کر کچھ اصلاحات سے مطلع فرما سکیں تو عین بندہ نوازی ہوگی۔

مولانا مسعود علی صاحب اور مسٹر عزیز صاحب اور دیگر حضرات سے سلام مسنون عرض کر دیں۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

وارد حال سلہٹ نئی سڑک، ۲۰ رمضان المبارک ۵۵ھ

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کا انتخاب آنجناب کی سپرد ہوا معلوم ہو کر مناسب معلوم ہوا کہ مولانا عبد الحلیم الصدیقی صاحب کی جانب توجہات عالیہ منعطف کراؤں، موصوف کی ذات محتاج تعارف نہیں، ان کی ادبی قابلیت، قومی خدمات سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے میں نے جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بیرسٹرایٹ لا چھپرا کی خدمت میں بھی ایک عریضہ اسی سلسلہ میں لکھا ہے، امید ہے کہ جناب والا مولانا عبد الحلیم صاحب کی کامیابی کا خیال فرمائیں گے، اگر خدانخواستہ ان کے لیے کوئی مجبوری ہو تو پھر مولانا اصغر حسین صاحب قائم مقام پرنسپل شمس الہدیٰ کو ترجیح دیجائے جو اس منصب کے اہل ہیں، اور کافی تجربہ رکھتے ہیں۔

مولانا عبد الحلیم صاحب علمی طبقہ میں باوجود اپنی مختلف فنون کی اعلیٰ قابلیتوں کے نہایت تکالیف سے زندگی بسر کر رہے ہیں، آنجناب کی ادنیٰ توجہ سے ان کی مشکلات کا حل ہو سکتا ہے، مدرسہ کی خدمات وہ انشاء اللہ باحسن وجوہ انجام دیں گے۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

صدر جمعیت علمائے ہند و صدر المدرسین دیوبند

۲۵ شعبان سنہ ۶۰

سیدنا المحترم زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج مبارک۔ والا نامہ انتظار شدید کے ایسے وقت میں باعث سرفرازی ہوا جب کہ میں انتہائی مصروفیت میں تھا، اختتام بخاری شریف تک تو یہ حالت رہی، اس کے بعد ہی متصلاً متعلقین کو ٹانڈہ پہنچانا پڑا، اور راستہ ہی میں ہلال رمضان بھی دیکھا گیا، ان وجوہ سے عریضہ کے ارسال میں تاخیر ہوئی،

محترما! مجھکو اس عرضی کے تحریر میں پس وپیش ہے، جس کو آنجناب نے ارشاد فرمایا ہے، یہ امر واقعی ہے کہ عزیزم فرید احمد دار العلوم میں تحصیل علم کر رہا ہے، اس سال میں اس نے جلالین وغیرہ کا امتحان دیا ہے، اور یہ امر بھی واقعی ہے کہ میرے بڑے بھائی مولوی محمد صدیق صاحب مرحوم کا وظیفہ ریاست کی طرف سے اقامت مدینہ منورہ کی بنا پر بطور دعاگوئی مقرر ہوا تھا، ان کے وفات کے بعد یہ وظیفہ ان کے اکلوتے لڑکے وحید احمد مرحوم کے نام پر جاری ہوگیا، وہ مدینہ منورہ سے طلب علم کے لیے دیوبند بھیجا گیا، اس کا وظیفہ وہاں وصول ہوتا تھا، اور اس کے اخراجات میں صرف ہوتا تھا، وہ طلب علم ہی کے زمانہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جبکہ وہ ۱۳۳۴ھ میں حجاز جارہے تھے، مدینہ منورہ گیا، اور واپسی پر انکے ساتھ ہی مالٹا گیا، اور پھر وہاں سے واپسی پر دیوبند میں اس نے کتابیں پوری کیں، اس کو عربی اور ترکی ادبیات سے خصوصی شغف تھا، جرمنی اور فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں بھی اس نے مہارت حاصل کر لی تھی، اس زمانہ طالبعلمی میں اس کا وظیفہ بھوپال ہی سے ملتا رہا، اس کا یہاں ہی فراغت کے بعد رشتہ داروں میں نکاح کر دیا گیا، اور وہ کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار میں مدرس ہوگیا، اس عرصہ میں وظیفہ مذکور بھی جاری رہا، مگر اکثر یہ ہوتا تھا کہ مدینہ منورہ میں وصول ہوتا تھا، اور یہاں آجاتا تھا، چند سال

کے بعد جبکہ وہ مدرسہ عزیزیہ میں مدرس تھا وہاں ہی بیمار ہوا اور بیماری کی حالت میں ٹانڈہ آیا اور وفات پاگیا، اس نے پانچ بچے چھوٹے چھوٹے اور بیوہ چھوڑے، ان بچوں کی تربیت اور نگہداشت کا کوئی ذریعہ دوسرا نہ تھا مجھکو ہی سب بار اٹھانا پڑا، واقعہ کی کیفیت حضرت قاضی محمد حسن صاحب مرحوم کے ذریعہ سے سرکار عالیہ ریاست میں پیش کرائی گئی تو یہ عطا ہوا عزیزم فرید احمد سلمہ کے نام جاری ہو گئے، اس کی پیدائش اور اسکے تمام بھائیوں بہنوں کی یہاں ہی ہوئی ہے، یہ حجاز ضرور گیا ہے مگر صرف ایام حج میں معہ اپنی والدہ اور والد مرحوم قیام کرکے واپس آگیا تھا، اسوقت اسکی عمر بہت تھوڑی تھی، اب یہ لکھنا کہ وہ مدینہ منورہ سے طلب علم کے لیے آیا ہے، بالکل خلاف واقعہ اور کذب ہے، اب آپ ہی فرمائیے کہ رائے کیا ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ عطا ہوا اسکے لیے جھوٹی عرضی دوں اور دھوکے سے اسکو حاصل کروں، اب تک جو کچھ ہوا مجھکو معلوم نہیں ہے کہ وہ کسی غیر واقعی امر کی بنا پر حاصل کیا گیا ہو، ظاہر ہے کہ جس طرح تمام مصاریف انجام پاتے ہیں باعانۃ اللہ پاجایا کرینگے، یہ عطا اسی مقدار نہیں ہیں کہ بغیر انکے زندگی بسر نہ ہو سکے، ابتک میں نے فرید احمد مذکور اور اس کے بھائی بہنوں کا بوجھ دار العلوم پر بھی نہیں ڈالا ہے جس طرح پر ہو سکتا ہے چلا رہا ہوں، اگر بغیر دروغ گوئی کے کام چل سکے فبہا ونعمت، ورنہ میری سمجھ میں تو یہ مضمون جو کہ جناب نے ارشاد فرمایا ہے نہیں آیا، آئندہ جو رائے عالی ہو اس سے مطلع فرمائیں، عنایت ہوگی

مولوی عبد الرحمن مظہر صاحب کے معاملہ میں مزید توجہ فرمانے کی ضرورت ہے، بالخصوص جبکہ وہ الزامات جو کہ قادیانیوں نے خلاف واقعات لگا کر ان کو فیل کرایا تھا، اور بالکل خلاف قانون انکو برخاست کرایا گیا، اگر ممکن ہو تو اس میں انکی اعانت فرمائیے واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ المسلم۔ (الحدیث) دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں، والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دار العلوم دیوبند

۱۳ رمضان المبارک ۶۶ھ

سیدنا المحترم زادت معالیکم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج مبارک، عدیم الفرصتی کی بنا پر ابتک کبھی عریضہ پیش کرنیکی نوبت نہیں آئی، امید وار معافی ہوں

اس وقت چند ضرورتوں کی بنا پر ارسال عریضہ کا شرف حاصل کرتا ہوں،

(۱) میرے بھتیجے وحید احمد مرحوم کے نام پر اسکے والد مرحوم اخوی مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم کا وظیفہ منتقل کردیا گیا

تھا جناب کو معلوم ہوگا کہ وحید احمد مرحوم ہمارے مدرسہ عزیزیہ میں تعلیمی فرائض عرصہ تک انجام دیتا رہا، کئی برس کا عرصہ

ہوتا ہے کہ اسکا انتقال ہوگیا، اس نے تین لڑکے اور ۲ لڑکیاں اور بیوہ چھوڑا تھا چونکہ یہ سب نابالغ اور محتاج تعلیم

تھے، اسلیے کوشش کی گئی کہ وہ وظیفہ عنداللہ ماہوار مرحوم کے بڑے لڑکے فرید احمد کے نام منتقل کردیا جائے تاکہ مصارف

تعلیم میں فی الجملہ اعانت ہو۔ چنانچہ کامیابی ہوئی اور وظیفہ عزیز موصوف کے نام جاری کردیا گیا، حضرت قاضی صاحب مرحوم

چھ ماہ یا، ماہ کے بعد مجموعی مقدار بھیج دیا کرتے تھے، مگر اب تقریباً ایک سال سے یہ مقدار نہیں آئی، عزیز موصوف

مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف وغیرہ کتابیں پڑھتا ہے۔ یہ وظیفہ اوقاف مدینہ منورہ کے ماتحت ہے، اس لیے

آنجناب کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، اور امید دار ہوں کہ اس کو دریافت فرماکر عزیز موصوف کے نام پر

دارالعلوم دیوبند میں ارسال فرمانے کا حکم فرمادیں۔

(۲) دوسری چیز نہایت اہم اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے کہ مولانا مظہر حسن صاحب مرحوم مکہ معظمہ میں عہدۂ اہتمام وظائف

حرمین شریفین پر مقرر تھے، انکے وصال کے بعد مولانا نظر احمد صاحب ابن مولانا الٰہی بخش صاحب فیض آبادی محشی حمداللہ وغیرہ

مقرر ہوئے، وہ جبکہ زیادہ ترضعیف ہوگئے تو مولوی عبداللہ مظہر صاحب جو کہ مولانا مظہر حسن صاحب کے بڑے صاحبزادے

ہیں، مقرر کیے گئے مگر ایام جنگ عظیم میں قادیانی سازش کی بنا پر ان کو برخاست کردیا گیا، پوری تفصیل ان کی منسلک تحریر

سے معلوم ہوگی، میں امید وار ہوں کہ آنجناب کی ادنیٰ توجہ اس معاملہ میں تمام مشکلات کو حل کردیگی، اس لیے

منسلک تحریر پیش کرتا ہوا ملتجی ہوں کہ اس معاملہ میں غیر معمولی توجہ منعطف فرماکر جلد از جلد عبداللہ مظہر صاحب کو بحال

فرمانے کی صورت کرادیں۔ والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند

ادبیات

آہ جواہر لال

از

یحییٰ اعظمی

خوں بن گئے ہیں صحنِ چمن کے گل و سمن — خنداں جو بزم گل ہیں وہ گل پیرہن نہیں

سرو و سمن فسردہ ہیں پژمردہ رُوئے گل — غم ہے چمن میں اب وہ بہارِ چمن نہیں

صحنِ چمن میں ہے صفِ ماتم بچھی ہوئی — پھولوں سے جو سجی تھی وہ اب انجمن نہیں

پہنے ہوئے کفن ہیں گل و لالہ و سمن — پھولوں کی یہ قبا نہیں یہ پیرہن نہیں

جس کی ہر اک نوا میں تھا پیغام زندگی — در داوہ عندلیبِ چمن نغمہ زن نہیں

زینت بنیں گے کس کی قبا کے شگفتہ گل — وہ سیم بر وہ سروِ سمن پیرہن نہیں

شعلہ کی نذر ہوگیا وہ پھول سا بدن — خاکستر اب ہے سامنے وہ گل بدن نہیں

تیری چتا پہ آتشِ گل ہے چمن فروز — صندل کی آگ اے گلِ تر شعلہ زن نہیں

پائیں گے اب وطن کے جواہر کو ہم کہاں — صد حیف اب وہ ہند کا لعلِ یمن نہیں

وہ عزم بے پناہ کا پیکر کہ راہ میں — کوہ گراں بھی ہو تو جبیں پر شکن نہیں

وہ جوششِ طلب کہ تھا پیہم رواں دواں — وہ سعیِ روز و شب کہ ذرا بھی تھکن نہیں

زیرِ قدم تھیں مشرق و مغرب کی وادیاں — منزل وہ کونسی تھی جہاں گام زن نہیں

رحلت سے اسکی محفل ملت ہے بے فروغ — جیسے وطن میں رنگ جمالِ وطن نہیں

چھائی ہوئی ہے غم کی گھٹا سارے ملک پر — وہ کون گھر ہے آج جو بیت حزن نہیں

آنکھیں وطن کی شدت غم سے ہیں دجلہ بار — ہمدم رواں یہ چشمۂ گنگ و جمن نہیں

ا۔ گھر، پوشش

سونی ترے بغیر ہے اب بزمِ قوم و ملک
رونق تھی جس کی تجھ سے وہ اب انجمن نہیں

زیبا ہے گر کہیں تجھے دُرِّ یتیم ہند
اٹھا نہ آج تک ترے جیسا زعیم ہند

آنکھوں کو ہو نصیب کہاں یہ ترا غبار
سنگم ہے آہ اب ترے پھولوں سے ہم کنار
آغوشِ دیدہ و دلِ دریا تھا کب سے باز
لینے کو دوشِ شوق پہ موجیں تھیں بیقرار
یہ کس عظیم رہبرِ ملت کے پھول ہیں
جس کے جلو میں جمع ہر اک قوم سوگوار
خاکِ وطن کا بیش بہا لعل شب چراغ
جس پر فدا تھی قوم وہ نہرو ئے نامدار

از فرق تا قدم وہ سراپائے دل نواز
جس کا رخ شگفتہ تھا سرمایۂ بہار
وہ زندگی کہ جوشِ عمل سے تھی حشر خیز
وہ زیست تھی جو شورشِ طوفاں سے ہمکنار
ہر لحظہ جس کا ولولۂ تازہ کا پیام
ہر لمحہ جس کا کارِ نمایاں سے شاندار
ہر دردِ غم میں قوم کا تھا مرکزِ نگاہ
وہ بیکسوں کا دوست غریبوں کا غمگسار
اٹھا جو کوئی سیلِ حوادث تو اسکی ذات
کام آئی بن کے سامنے اک سدِّ استوار
ٹوٹا اگر کسی پہ کہیں کوئی کوہِ غم
دل دردمند سینۂ صد چاک تھا فگار
اس دورِ جنگ میں تھا وہی اک نقیبِ امن
دنیا سے تھا خطاب یہی اس کا بار بار
صد حیف آج آتشِ سوزاں کی نذر ہے
وہ صلح و آشتی کا نشاں امن کا منار
تشبیہ جس کو دیتے تھے پھولوں سے کل تلک
وہ جسمِ ناز آج ہے شعلوں سے ہمکنار
تنہا نہیں یہ کشورِ ہندوستاں کا غم
اس ابتلا میں مشرق و مغرب ہیں اشکبار
کس کو ملا تھا دہر میں یہ رتبۂ قبول
حاصل تھا کس کو عالمِ انسانیت کا پیار
وہ ہستیِ عزیز کہ دنیا کو تھی حبیب
وہ پیاری شخصیت کہ تھی محبوبِ روزگار
خاکِ دیارِ ہند سے اٹھا نہ آج تک
ایسا کوئی محاسنِ فطرت کا شاہکار
وہ جس کے دم قدم سے تھی اقوامِ دہر میں
عظمت وطن کی کشورِ آزاد کا وقار

افسوس اب وہ پیکرِ عظمت نہیں رہا
وا حسرتا جواہرِ ملت نہیں رہا

دار المصنفین کے تین اہم سلسلے

دار المصنفین اپنے آغازِ قیام سے لیکر اس وقت تک مختلف علوم و فنون پر ۹۳ کتابیں شائع کر چکا ہے، ان
[میں] سلسلۂ سیرۃ النبی، سلسلۂ سیر الصحابہ، اور سلسلۂ تاریخِ اسلام جن میں سے ہر ایک متعدد جلدوں پر مشتمل ہے، بہت
[مق]بول ہیں، اور ان کے لاتعداد اڈیشن نکل چکے ہیں، سیرۃ النبی کی بعض جلدوں کا ترکی و فارسی و تامل بانو[ں میں]
[بھی] ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اُن کے علاوہ اور دوسری زبانوں میں ابھی ہو رہا ہے۔

۱۔ سلسلۂ سیرۃ النبی ﷺ

[جلد] اوّل	(ولادت سے فتح مکہ تک)	لعہ
[جل]د دوم	(اخلاق و عادات)	۸
[جلد] سوم	(معجزات)	۴
[جلد] چہارم	(منصب نبوت)	۴
[جلد پنج]م	(عبادات)	معہ
[جلد ش]شم	(اخلاق)	للعہ

۲۔ سلسلۂ سیر الصحابہ رض

[سیر الصحابہ جلد اول خلفائ]ے راشدین		صہ
[سیر الصحابہ مہاج]رین جلد اوّل	(عشرہ مبشرہ)	۸
" " دوم	(فتح مکہ سے پہلے کے صحابہ کرام)	صہ
[سیر الان]صار اوّل		۸
[سیر الا]نصار دوم		للعہ
[سیر الص]حابہ جلد ششم	(حضرت حسنین کے حالات)	للعہ ۱۲
سیر الصحابہ جلد ہفتم	(فتح مکہ کے بعد کے صحابہ کرام)	صہ
سیر الصحابیات	(ازواج و بناتِ طاہرات وغیرہ کے حالات)	۸
اسوۂ صحابہ (۱)	(صحابہ کے عبادات و اخلاق)	للعہ ۴
اسوۂ صحابہ (۲)	(صحابہ کے سیاسی و انتظامی کارنامے)	۸

۳۔ سلسلۂ تاریخ اسلام

تاریخ اسلام حصہ اوّل	(عہد رسالت و خلافتِ راشدہ)	۴
" " دوم	(بنی امیہ دمشق)	صہ ۱۲
" " سوم	(خلافتِ عباسیہ کی تاریخ سفاح سے متقی باللہ تک)	معہ
" " چہارم	(مستعصم باللہ تک عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی تاریخ اور اس کے تمدنی کارنامے)	معہ